غلام عبّاس: فکر و فن

مرتّب:

ایم۔ خالد فیّاض

غلام عباس

(۱۹۰۹ء-۱۹۸۲ء)

فکر و فن

مرتب:

ایم۔ خالد فیاض

معاونین:

رابعہ ظفر، روبینہ الماس،
محمد بلال بھٹی، رحمت علی شاد

نقش گرہ راولپنڈی

کتاب: غلام عباس: فکروفن

مرتب: ایم۔خالد فیاض

پہلی اشاعت: اپریل، 2010ء

ناشر: ذوالفقار احسن (03008704221)

سید خاور علی رضا (0307-6727312)

تعداد: پانچ سو

قیمت: 500 روپے

مطبع: فیض الاسلام پریس، راولپنڈی

رابطہ مرتب: فون: 0333-4284895

ای میل: fayyazkhalid35@yahoo.com

نقش گر پبلی کیشنز ٥ راولپنڈی

naqshgar@yahoo.com

ابو جی کے نام

سب سے پہلے جنھوں نے یہ سکھایا
کہ بڑے غلط بھی ہو سکتے ہیں

اور

ان کے قول و فعل سے یہ جانا
کہ بڑے صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔

ترتیب

ابتدائیہ

غلام عباس پر تنقیدی مواد کی کمی اس کتاب کا محرکِ اوّل ہے۔ شہزاد منظر کی ''غلام عباس۔ایک مطالعہ'' اور سویا مانے یاسر کی ''غلام عباس'' کے علاوہ کوئی تیسری تنقیدی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لیے کافی عرصے سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ غلام عباس پر لکھے گئے مختلف ناقدین کے جو تھوڑے سے بہت مضامین ہیں، ان کو اکٹھا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

پچھلے سال غلام عباس کی سوویں سالگرہ آئی اور خاموشی سے گزرنے لگی۔ اس سے میری آتشِ شوق اور تیز ہوئی اور میرا ارادہ پختہ ہو گیا۔ میری خواہش تھی کہ صرف پہلے سے لکھے گئے مضامین ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ کچھ نئے مضامین بھی لکھوا کر کتاب میں شامل کیے جائیں تا کہ دیکھا جا سکے کہ آج کا ناقد غلام عباس کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے فکشن کے متعدد معاصر ناقدین سے درخواست کی گئی۔ اگرچہ نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں نکلے مگر کچھ نہ کچھ نئی چیزیں بھی سامنے آ گئیں۔ پہلے سے لکھے گئے مضامین کو ''افکارِ عالیہ'' کی ذیل میں رکھا گیا ہے اور اس کتاب کی غرض سے لکھوائے گئے نئے مضامین کو ''افکارِ تازہ'' کا عنوان دیا گیا ہے۔

یہ امر بھی پیشِ نظر رہا کہ غلام عباس کی کچھ افسانوی تحریریں ایسی ہیں جو اہم ہونے کے باوجود ''زندگی، نقاب، چہرے'' (کلیاتِ غلام عباس) میں شامل نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لیے اگر انھیں بھی شامل کر لیا جائے تو غلام عباس کی بنیادی افسانوی تحریریں مکمل ہو جائیں گی۔ لہٰذا انھیں بھی تلاش کر کے اس انتخاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ان تحریروں سے متعلق تصحیحِ متن کا دعویٰ قطعاً نہیں۔ اگر کبھی کلیاتِ غلام عباس مرتب کرنے کا وقت ملا تو یہ کام ضرور کیا جائے گا۔

شہزاد منظر اور سویا مانے یاسر کی کتاب میں سے کچھ نہیں لیا گیا۔ یہاں شہزاد منظر کا جو مضمون شامل ہے، وہ ان کی کتاب ''علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ'' میں سے لیا گیا ہے جو ''غلام عباس۔ایک مطالعہ'' میں شامل نہیں۔ خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر فردوس انور قاضی اور ڈاکٹر قاضی عابد کے

مضامین اُن کے تھیسز میں سے اخذ کیے گئے ہیں جو غلام عباس پر کچھ اور زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے عنوانات مرتب نے منتخب کیے ہیں۔

اگرچہ کتاب کا بنیادی مقصد غلام عباس کے فکر وفن کو اجاگر کرنا ہے اور اس کے لیے تنقیدی مضامین کو پیش کرنا ہی کتاب کا بنیادی مقصد ہے مگر عام قاری کی سہولت کے لیے غلام عباس کے شخصی اور قلمی کوائف اور شخصی یادوں پر مشتمل دو مضامین بھی شاملِ کتاب کر لیے گئے ہیں۔

غلام عباس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والے ڈاکٹر علمدار حسین بخاری صاحب کا، دو مضامین پر مشتمل ایک گوشہ الگ بنا دیا گیا ہے تاکہ قاری دیکھ سکے کہ ہمارے کچھ تخلیق کاروں کو جینوئن ڈاکٹر بھی نصیب ہوئے ہیں۔

رابعہ ظفر، محمد بلال بھٹی، روبینہ الماس اور رحمت علی شاد اس علمی کاوش کے معاونین میں شامل ہیں۔ کتاب ترتیب دینے کے ارادے سے لے کر اس کی تکمیل تک ہر مرحلے پر ان احباب کا تعاون اور کوشش شامل حال رہی اور اسی کی بدولت آج یہ پھیلا ہوا کام کتاب کی صورت میں سمٹ کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یوں تو معاونین کی کاوشیں بہت زیادہ رہیں لیکن ان کے علاوہ بھی چند احباب نے مواد کی فراہمی میں بہت مدد کی۔ محمد عباس نے غلام عباس کے افسانے ''لچک''، ''اوتار'' اور ''دھنک'' مہیا کیے۔ جناب شوکت نعیم قادری نے ''جلاوطن'' اور ''رینگنے والے'' عطا کیے۔ جبکہ آخری دنوں میں میری درخواست پر انتہائی کم وقت میں مبین مرزا صاحب نے فضیل جعفری اور شمیم احمد کے مضامین ارسال کیے۔ ان احباب کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

مبشر احمد میر صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتا کیونکہ اس دوران سب سے زیادہ تنگ میں نے اُنہی کو کیا اور انھوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے ان تمام تنگیوں کو جھیلا۔ اسی طرح محمد عثمان خالد نے بھی غلام عباس سے محبت میں جو دوڑ دھوپ کی اس کا اظہار ممکن نہیں۔

مظہر عباس، شاہد نواز اور ڈاکٹر طارق محمود ایسے دوست ہیں جن کی ہر طرح کی معاونت مجھے ہر حال میں میسر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عامر سہیل، ڈاکٹر عابد سیال، لیاقت علی اور نسیم عباس ان دوستوں میں

سے ہیں جن کے مشوروں کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔

تنویر صاغر ایک ایسی متحرک دوست ہستی ہے جس کے ہونے سے کام کرنے کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ جب بھی کام کے دوران ناامیدی سی پیدا ہونے لگے، تنویر صاغر کو فون کریں، فون کے بعد آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ کام ہو کر رہے گا۔ ڈاکٹر سعادت سعید صاحب، ڈاکٹر علمدار حسین بخاری صاحب، ڈاکٹر قاضی عابد صاحب اور ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی صاحب مجھے کام کرنے پر اُکساتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس پر یہ کتاب "جلد اوّل" ہے۔ جلد دوم کا بہت سا مواد جمع ہو چکا ہے جو ضخامت کے خوف سے یہاں شامل نہیں کیا گیا لیکن جلد ہی وہ بھی شائع ہو جائے گا۔

اور آخر میں مَیں سب سے زیادہ شکر گزار ہوں اپنے ابو جی، امی جی اور اپنی شریکِ حیات آسیہ خالد کا، کہ جن کی دعائیں اور محبتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔

ایم۔ خالد فیاض

گوندنی والا تکیہ

عرضِ حال

گوندنی والے تکیے کا خیال، مدت ہوئی مجھے لاہور میں سوجھا تھا۔ جہاں ایسے تکیے بہ کثرت ہیں یا ہوا کرتے تھے۔ یہ تکیے غریب غربا اور ناخواندہ لوگوں کے لیے وہی کام دیتے تھے جو امراء اور پڑھے لکھے طبقوں کے لیے شہروں کے کلب گھر، مقصد دونوں کا تفریح بہم پہنچانا ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک بہت سستی قسم کی تفریح ہوتی تھی اور دوسری بہت مہنگی قسم کی تفریح۔

اپنے لاہور کے قیام کے دوران مجھے کبھی کبھار مختلف تکیوں میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ کبھی پنجابی کا کوئی مشاعرہ اس کا محرک ہوتا تھا۔ کبھی دو نامی گرامی گویوں کا استادی گانوں کا مقابلہ، کبھی حال و قال کی کوئی محفل اور میں ایک محویت کے عالم میں اس کا مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔

ان ہی دنوں میں نے دو تین بڑے روسی ناول پڑھے تھے۔ خیال ہوا کہ ان کی پیروی میں میں بھی اس موضوع پر کوئی طویل ناول لکھوں۔ مگر افسوس کہ میری مسلسل ملازمت نے مجھے کبھی اس کا موقع ہی نہ دیا۔ لاہور میں بھی نہیں اور اپنے دس سالہ دلی کے قیام میں بھی نہیں۔ یہاں تک کہ تین برس لندن میں بھی رہ آیا مگر اس خیال کی تکمیل نہ ہو سکی۔

۱۹۵۲ء میں جب میں لندن سے کراچی پہنچا تو ان دنوں میرے مرحوم دوست عزیز احمد محکمہ اطلاعات ونشریات کے ڈائریکٹر تھے۔ علاوہ اپنے اور فرائض کے ماہنامہ "ماہِ نو" شائع کرنا بھی ان کے ذمے تھا۔ وہ اکثر مجھ سے افسانے کی فرمائش کرتے۔ میں وعدہ کر لیتا مگر پورا نہ کر پاتا۔

آخر ایک دن میں نے سوچا کہ گوندنی والے تکیے پر طویل ناول جیسا کہ میں چاہتا ہوں، کبھی لکھ نہیں پاؤں گا البتہ اس موضوع پر ایک چھوٹا سا ناول یا ایک طویل مختصر افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ اپنے محترم دوست مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے ہفتہ وار اخبار "شیرازہ" کے لیے میں "جزیرۂ سخنوراں" کے نام سے ایک مختصر ناول آٹھ دس قسطوں میں کامیابی کے ساتھ پہنچا چکا تھا۔ اس لیے ایک ماہنامے کے لیے ایسا سلسلہ دوبارہ شروع کرنا مشکل نہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے "گوندنی والا تکیہ" بارہ قسطوں میں "ماہِ نو" کے لیے لکھنے کی حامی بھر لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرتبہ بھی مجھے شرمندگی نہیں اٹھانی پڑی۔

اب سنیے کہ جیسے ہی جنوری ۱۹۵۴ء کے "ماہِ نو" میں ناول کی بارھویں قسط شائع ہوئی۔ دلی میں میرے ایک "قدرداں" نے جھپاک سے اسے کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ خود ہی کتاب کا نام بدل کے "جب محبت روتی ہے" رکھ لیا۔ اور اس کا انتساب گوندنی والے تکیے کے نام کر دیا۔ نہ کوئی خط لکھا، نہ اجازت مانگی، نہ کوئی جلد بھیجی۔ کہتے ہیں خودکشی کے محرک عموماً ایسے ہی واقعات ہوا کرتے ہیں۔

اب میں نے یہ ناول تھوڑی سی رد و بدل کے بعد دوبارہ لکھا ہے۔ اس میں پنجابی کے جو اشعار درج ہیں، انہیں جناب حفیظ ہوشیارپوری نے میری فرمائش پر لکھا تھا۔ اس کے لیے میں ہمیشہ مرحوم کا شکر گزار

رہوں گا۔

غلام عباس
۲۷ جولائی ۱۹۸۲

☆☆☆

خدا خدا کر کے ریل کا طولانی سفر ختم ہوا اور میں قلی سے اپنا سوٹ کیس اور بیگ اٹھوا، مسافروں کے جمگھٹ سے نکلا اور اپنے قصبے کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر پڑا۔

میں ایک طویل مدت کے بعد اس خطۂ زمین پر دوبارہ قدم رکھ رہا تھا جو میرا آبائی وطن تھا۔ مگر سفر کی تکان، سردی اور بے خوابی کی وجہ سے دل، دماغ پر کچھ ایسا بوجھ تھا کہ نہ تو حبِ وطن نے میرے دل میں سوز و گداز کی کوئی کیفیت پیدا کی اور نہ وہ عرفانی مسرت ہی حاصل ہوئی جو وطن واپس آنے پر عموماً لوگوں کو ہوا کرتی ہے۔ اس کے برعکس میں یہاں آ کر ایک اجنبیت محسوس کرنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں۔

میں ابھی بچہ ہی تھا کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور جب والد نے انتقال کیا تو میری عمر تقریباً پندرہ برس کی تھی۔ اس صدمے سے میں سخت دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اٹھتی جوانی تھی۔ دل میں امنگیں تھیں۔ سر میں آزادی کی دُھن ایسی سمائی کہ ایک رات میں چپکے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور جدھر منہ اٹھا چل دیا تھا۔

سیاحت کے شوق اور معاش کی تلاش نے مجھ سے ملک ملک کی خاک چھنوائی تھی اور آخر کار میں سمندر پار ایک غیر ملک میں بس گیا تھا۔ میں نے کچھ دولت یا ثروت حاصل نہیں کی تھی۔ معمولی تجارت کا کاروبار تھا۔ مگر میں اس میں کچھ اس بری طرح پھنس گیا کہ نکلنا محال ہو گیا۔ اس پر میں نے شادی بھی وہیں ایک نیک بخت سے کر لی تھی۔ جس نے اور بھی پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور میں ہمیشہ کے لئے دیارِ غیر کا ہو کے رہ گیا تھا۔

اب جب کہ کوئی بیس برس کے بعد بعض اہم کاروباری امور کے سلسلے میں میرے لئے وطن کا چکر لگانا ناگزیر ہو گیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ کاروبار سے فارغ ہو کر واپسی پر اپنے اس جنم بھوم کو بھی ایک نظر دیکھتا چلوں گا۔ میرے اس ارادے کو اس وجہ سے اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس قصبے میں ہماری کچھ آبائی جائیداد تھی جس کی فروخت کی بات چیت ایک عرصے سے ہو رہی تھی، مگر چونکہ اس کے ورثا میں مَیں بھی شامل تھا، اس لیے میری عدم موجودگی میں اس کی تکمیل نہ ہو سکی تھی لہٰذا اس سلسلے میں میرا اس قصبے میں آنا لازمی ہو گیا تھا۔

اس بیس برس کے طویل عرصے میں جو میں نے باہر گزارا تھا، قصبے کے اسٹیشن میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نئی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ قصبہ بہت پھیل گیا تھا۔ جو علاقے میرے ہوش میں اُجاڑ پڑے رہتے تھے، وہاں اب چھوٹے چھوٹے بازار بن گئے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ اسٹیشن کے باہر جہاں کبھی اِکّہ بھی مشکل سے ملا کرتا تھا وہاں اب تانگوں اور

ٹیکسیوں کے الگ الگ اڈے موجود تھے۔

مجھے دیکھتے ہی دو تین تانگے والے شور مچاتے ہوئے لپکے۔ میں نے ایک کوچوان کو چُن کر جو مجھے نسبتاً شریف صورت نظر آیا، اس ہوٹل کا پتہ بتایا جس میں ٹھہرنے کی مجھے وکیل نے ہدایت کی تھی اور اپنا مختصر سا سامان اس کے تانگے میں رکھ کر سوار ہو گیا۔ جائیداد کے دوسرے ورثا کو جو میرے چچیرے بھائی اور بہنیں تھیں، اگلے روز پہنچنا تھا۔ میں ان سے ایک روز پہلے اس لیے آ گیا تھا کہ اپنے جنم بھوم کو جی بھر کے دیکھ سکوں۔

تانگہ چلا تو میں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جا بجا پختہ اینٹ کی بنی ہوئی عمارتیں نظر آئیں۔ کچے گھروندے بھی دکھائی دیئے مگر خال خال۔ اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا پارک بھی دیکھنے میں آیا جہاں لوگ دھوپ میں گھاس پر بیٹھے بڑے مگن معلوم ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ میرے بعد اس قصبے نے بہت ترقی کر لی تھی اور مجھے اس پر خوشی ہونی چاہیے تھی مگر اس کو کیا کروں کہ میرے دل میں لحہ بہ لحہ بیگانگی کا احساس بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اسٹیشن کے سوا مجھے اب تک کوئی جانی پہچانی شے نظر نہ آئی تھی۔ کوئی ایسی چیز جس کو دیکھ کر بچپن کی کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہو جاتی۔

تھوڑی دیر میں تانگہ ہوٹل کے پاس پہنچ گیا جو ایک بازار کے نکڑ پر تھا۔ یہ ہوٹل دیکھنے میں ایسا ہی تھا جیسے شہروں میں معمولی درجے کے ہوتے ہیں۔ تانگے والے نے بتایا کہ آس پاس اور بھی کئی ہوٹل ہیں مگر سب میں اچھا یہی ہے۔ قصبے میں ہوٹلوں کا کھل جانا بھی بلاشبہ اس کی ترقی کی علامتوں میں سے ایک تھا۔ وگرنہ میرے زمانے میں تو یہاں فقط ایک سرائے ہوا کرتی تھی۔

ہوٹل کا منیجر یا مالک جو کوئی بھی وہ تھا، مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے کہا:

"یہاں آپ کو اپنے شہر کا سا آرام تو نہیں مل سکے گا۔ البتہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف فرما دیجیے گا۔ ہم حتی الامکان مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

وہ تھا تو ادھیڑ عمر مگر چاق و چوبند اور چرب زبان۔ اس کے لہجہ اور لباس سے قصباتی پن ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ نہ جانے کیوں میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میں اسی قصبے کا قدیمی باشندہ ہوں۔

مجھے رہنے کے لئے جو کمرہ دیا گیا وہ خاصا کشادہ اور صاف تھا۔ اس میں رنگین پایوں والا ایک بڑا سا نواڑی پلنگ بچھا تھا۔ ایک پرانی وضع کی گول میز اور دو کرسیاں تھیں۔ علاوہ ازیں ایک دیسی ساخت کا آئینہ، دو تین قطعات چوکھٹوں میں جڑے ہوئے، بعض فلمی ستاروں کے رنگین فوٹو اور ایک پچھلے سال کا کیلنڈر جس پر کسی چھاپے خانے کے معمر پروپرائٹر کی تصویر تھی، دیواروں پر مختلف زاویوں سے لٹکے ہوئے کمرے کی زینت بڑھا رہے تھے۔ میز پر پیتل کی ایک منقش گول راکھ دانی تھی۔ غرض مسافروں کے آرام کا حتی المقدور خیال رکھا گیا تھا۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اور بیگ کمرے میں ایک طرف رکھوا دیا۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت نکل ہی چکا تھا۔ اس لیے صرف چائے، توس اور انڈے پر اکتفا کی۔ اس

کے بعد بیگ سے اپنا مختصر سا بستر نکالا اور کمبل اوڑھ پلنگ پر دراز ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں آنکھ لگ گئی۔
کوئی دو گھنٹے کے بعد اٹھا تو طبیعت بحال تھی۔ سفر کی تکان بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ شام ہونے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں جلدی جلدی لباس تبدیل کر قصبے میں گھومنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔
صبح سے اب تک نئی آبادی دیکھ دیکھ کر طبیعت بھر چکی تھی۔ چنانچہ اب میرے قدم کشاں کشاں مجھے اس علاقے کی طرف لیے جا رہے تھے۔ جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ وہ علاقہ ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ البتہ نئے نئے بازار اور سڑکیں بن جانے سے مجھے دو چار جگہ راستہ معلوم کرنے میں وقت ہوئی۔ لیکن بالآخر میں نے خود کو اپنی اسی پرانی حویلی کے سامنے پایا۔ جس میں میری نال گڑی تھی۔ یہ اور اس کے ساتھ والی حویلی دونوں قریب قریب ایک ہی نقشے کی تھیں جنہیں میرے جدِ امجد نے تعمیر کرایا تھا۔ اب جو جائیداد فروخت ہونے والی تھی وہ انہی حویلیوں پر مشتمل تھی۔ انہیں ایک مدت سے کرائے پر اٹھا دیا گیا تھا۔ کیونکہ میرے بعد میرے اقربا نے بھی قصبے سے نکل شہروں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔
دونوں حویلیوں کے در و دیوار سے شکست و ریخت کے آثار ہویدا تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی دیکھ بھال کی طرف خاصی بے توجہی برتی گئی ہے۔ ان حویلیوں کے سامنے گلی میں چار پانچ بچے قریب قریب ایک ہی عمر کے، میلے کچیلے کپڑوں پر رنگ برنگے سویٹر پہنے ریٹھے کی گولیوں سے کھیل رہے تھے۔
مجھے دیکھتے ہی ایک بچے نے جس کی صورت سے بڑی معصومیت ٹپکتی تھی نہ جانے کس جذبے کے تحت اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔ میں بھی بے اختیار مسکرا دیا۔ جی میں آیا کہ ان بچوں کو مٹھائی کے لیے کچھ پیسے دوں مگر پھر اس خیال سے کہ شاید ان کے ماں باپ کچھ شک کریں یا برا مان جائیں میں نے ہاتھ روک لیا اور جو بچہ ہنسا تھا اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
میں یہاں پل بھر ہی کو رکا تھا مگر اس ذرا سے وقفے میں میرا سارا بچپن میری آنکھوں میں پھر گیا تھا۔ اس بچے کی معصوم ہنسی نے بیگانگی کے اس طلسم کو یک لخت توڑ دیا تھا جو دوپہر سے مجھ پر مسلط تھا۔ میرا دل شدتِ جذبات سے بھر آیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بار بار اس کوچے کا طواف کروں۔ لیکن میں نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس محلے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا کہ آج سے بیس برس قبل میں اسے چھوڑ گیا تھا۔
ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک کھلا میدان ہوا کرتا تھا۔ جہاں ہم لڑکے اسکول سے آنے کے بعد کھیلا کرتے تھے۔ اور یہیں وہ پرانا تکیہ بھی تھا جس کو ''گوندنی والا تکیہ'' کہتے تھے۔ کیونکہ اس میں گوندنی کے آٹھ دس پیڑ تھے۔ ہم لڑکپن میں ان درختوں کی چھاؤں میں کھیلا کرتے اور گوندنی کا موسم آتا تو پیڑوں پر چڑھ کے گوندنی توڑا کرتے۔
تکیے کا سائیں ہمیں گوندنی توڑنے سے کبھی منع نہیں کرتا تھا۔ البتہ جب کوئی لڑکا شاخ توڑ دیتا تو وہ ناراض ہو جاتا اور کبھی کبھی کان بھی اینٹھ دیتا۔ اس کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ ہم گوندنی توڑنے کے بعد اسے دکھا دیا کریں۔ وہ ہم سے گوندنی لیتا نہیں تھا۔ بس ایک نظر دیکھ لیا کرتا۔ اگر اسے خبر ہو جاتی کہ کوئی لڑکا اسے دکھائے بغیر گوندنی لے گیا تو وہ اس کا حلیہ یاد رکھتا۔ اور پھر کبھی اسے گوندنی کے پیڑوں پر چڑھنے نہ دیتا۔

کئی مرتبہ دکانداروں نے ان پیڑوں کے پھل کا ٹھیکہ لینے کے لئے اسے خاصی معقول رقم پیش کی مگر اس نے کبھی منظور نہ کیا۔ وہ کہا کرتا "یہ تو محلے کے بچوں کا مال ہے۔"

یہاں سے میں نے سیدھا اس تکیے کا رخ کیا۔ مگر نہ تو میدان کا پتہ تھا نہ تکیے کا۔ ہر طرف پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے مکان نظر آ رہے تھے۔ میں نے خیال کیا شاید راستہ بھول گیا ہوں مگر ہر پھر کر ہر مرتبہ وہیں آ نکلتا تھا۔ جس جگہ تکیہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں اب ایک چار دیواری کھینچ دی گئی تھی۔ میں نے اس کے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک مدرسے کے سے آثار دکھائی دیے۔ ایک لڑکا باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میاں صاحبزادے! یہاں گوندنی والا تکیہ ہوا کرتا تھا وہ کیا ہوا؟"

لڑکے نے جس کی عمر کوئی دس گیارہ برس کی ہو گی جواب دیا۔

"کونسا تکیہ؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا۔"

"تم اسی محلے میں رہتے ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ سامنے اونچے بخارچے والا ہمارا ہی مکان ہے۔"

اتنے میں ایک معمر شخص پاس سے گزرے۔ میں نے انہیں سلام کیا اور پوچھا۔

"حضرت! یہاں جو گوندنی والا تکیہ ہوا کرتا تھا وہ کیا ہوا؟"

ان بزرگ نے مجھ پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی۔ پھر فرمایا:

"آپ شاید مدت کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں؟"

"بجا فرمایا جناب نے۔ کوئی بیس برس بعد۔"

"جبھی تو۔ صاحب وہ تکیہ اٹھوا دیا گیا تھا۔"

"یہ کیوں؟ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ذرا اس کی تفصیل سے آگاہ کیجیے۔ ممنون ہوں گا۔"

ایک ذرا تامل کے بعد وہ یوں گویا ہوئے۔

"پندرہ یا شاید سولہ برس ہونے کو آئے کہ اس تکیے کے متولی کا انتقال ہو گیا۔ بھلا سا نام تھا اس کا......"

"نگینہ سائیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں یہی نام تھا۔ وہ خود تو نیک دل اور بہت اچھی طبیعت کا تھا۔ مگر اس کے مرنے کے بعد جو لوگ اس تکیے پر قابض ہوئے ان کا کردار اچھا نہیں تھا۔ دن رات چرس کے دم لگنے لگے۔ بھنگ گھوٹی جانے لگی۔ اور یہ تکیہ اچھا خاصا اوباشی کا اڈا بن گیا۔ بازاری عورتیں کھلم کھلا یہاں آنے لگیں۔ آخر کار قصبے والوں نے آپس میں مشورہ کر کے اس تکیے کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک مدرسہ قائم کر دیا۔"

"اس تکیے میں کسی بزرگ کا مزار بھی تو ہوا کرتا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں مستان شاہ کا۔ وہ مزار اب بھی مدرسے کے صحن میں موجود ہے۔ مگر کسی مجاور کو یہاں رہنے کی اجازت نہیں۔ مدرسے کے معلم خود ہی اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں۔"

''گوندنی کے درخت تو کٹوا ہی دیئے گئے ہوں گے؟''

''بس ایک رہنے دیا گیا ہے جو مستان شاہ کی قبر پر سایہ کیئے ہوئے ہے۔''

میں یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے۔ اس کے بعد میں نے ان بزرگ کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کیا اور مدرسے کے اندر داخل ہو گیا۔

مدرسے کے صحن میں پختہ اینٹ کا فرش تھا۔ اس کے ایک گوشے میں گوندنی کے ایک پیڑ کے نیچے ایک قبر نظر آئی جو سبز رنگ کی ایک بوسیدہ سی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس پر کچھ سوکھے ہوئے پھول پڑے تھے۔ میں نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ پھر چپ چاپ واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو حد درجے کی افسردگی مجھ پر طاری تھی۔ اس تکیے کے اٹھ جانے کا مجھے بڑا قلق ہوا تھا۔ مگر میں قصبے والوں کو الزام نہیں دیتا۔ شاید وہ اس زمانے کے حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے فیصلے میں حق بجانب ہوں۔ ممکن ہے میں اس زمانے میں یہاں ہوتا تو انہی کا ساتھ دیتا۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تکیہ غریب غربا کا مونس اور سارے قصبے کی تفریح گاہ تھا۔ جس سے وہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیئے گئے۔

وہ علی الصباح تکیے سے بھیروں کے میٹھے سُروں میں ''اللہ ہو اللہ جلِ شان اللہ'' کی الاپ کا بلند ہونا، وہ حال و قال کی محفلیں، وہ پنجابی کے مشاعرے، وہ بٹیروں کی پالیاں، وہ گویوں کے مقابلے، وہ گوندنی کی شاخوں میں لٹکے ہوئے تیتروں کا ''سبحان تیری قدرت'' چہکارنا، کسی پیڑ کی چھاؤں میں کوئی نومشق ستار پر گت بجا رہا ہے۔ کہیں چوپڑ کھیلی جا رہی ہے۔ کہیں ہیر پڑھی جا رہی ہے اور سننے والے دم بخود بیٹھے ہیں۔ پاس ہی بچے کانچ اور ریٹھے کی گولیوں سے کھیل رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے لڑنے جھگڑنے اور شور مچانے پر بڑوں میں سے کوئی اٹھتا ہے اور دو ایک کے چپت لگا جاتا ہے اور بچے پھر کھیلنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

وہ تکیے کے کنویں پر گاؤں کی الھڑ مٹیاروں کے جھرمٹ، کوئی کمر پر مٹکی دھرے، کوئی سر پر گاگر اٹھائے پانی بھرنے کے لیے اپنی باری کی منتظر۔ جب سقے اپنی مشکیں بھرنے لگتے تو بڑبڑاتے ہوئے، دو ایک ڈول ان کی مٹکی یا گاگر میں بھی ڈال دیتے۔ بعض چنچل لڑکیاں سقوں کی مدد سے بے نیاز خود چرخی تھام کنویں سے پانی نکالنے لگتیں۔ دوپٹہ سر سے سرک جاتا، کپڑے پانی سے تر ہو کر بدن سے چپک جاتے۔ مگر وہ شرماتی لجاتی پانی بھرے جاتیں۔

اور پھر اس تکیے کی جان اس کا بلند بالا نگینہ سائیں، گلے میں رنگ برنگے منکوں کی مالا ڈالے، سردی گرمی اپنی ایک ہی پرانی کالی کملی میں اپنے نیم برہنہ جسم کو چھپائے، کبھی دیوانہ، کبھی فرزانہ مگر ہر حال میں کہہ و مہہ کی خدمت کے لیے مستعد۔

شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں خاصی خنکی تھی۔ مگر میں نے بجلی کا بلب روشن نہیں کیا تھا۔ کیونکہ کمرے کی نیم تاریکی سکون بخش تھی۔ میں کمبل اوڑھ کر آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ گوندنی والا تکیہ اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ میری نظروں میں پھرنے لگا......

دیہات کی صبح بھی کیا نورانی ہوتی ہے۔ دھوئیں اور کثافت سے پاک و صاف فضا، مٹی کی سوندھی

سوندھی خوشبو۔ دور دور تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت اور پھر جب ان کے پیچھے سے سورج کی پہلی کرنیں پھوٹتی ہیں تو پھول پتیوں پر پڑی ہوئی شبنم کی بوندیں، موتیوں کی طرح دمکنے لگتی ہیں۔

گرمیوں کے دن ہیں اور وہ زمانہ جب گوندنی کے پیڑوں پر پھل آتا ہے اور شاخیں گوندنی کے گچھوں سے لد جاتی ہیں۔ جن کا پیلا پیلا سنہرا رنگ پیڑوں کی ہریالی پر چھا جاتا ہے اور پتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

گوندنی والے تکیے کے پیڑوں پر عجب بہار ہے۔ شاخیں پھل کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہیں۔ ہر ایک پیڑ پر چار چار پانچ پانچ لڑکے چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی لنگوٹی باندھے ہے تو کسی نے تہمد کو گھٹنوں سے اونچا کرکے لنگوٹ کی طرح کس لیا ہے اور اس کے ایک پلے کو اس طرح دوہرا کرکے اُڑس لیا ہے کہ ایک جھولا سا بن گیا ہے جس میں وہ گوندنی کے گچھے توڑ توڑ کے ڈالتا جاتا ہے۔ بعض لڑکوں نے بھڑوں کے ڈنک سے بچنے کے لیے کُرتا اتار کر اپنے چہرے اور سر پر لپیٹ رکھا ہے۔

اس وقت شدت کی دھوپ پڑ رہی ہے۔ ہوا ایسی بند ہے کہ پتا تک نہیں ہلتا۔ صبح سے جو لوگ تکیے میں جمع تھے، ایک ایک کرکے اپنے اپنے گھر کھانا کھانے یا آرام کرنے چلے گئے ہیں۔ اسی لیے ان لڑکوں کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے گوندنی توڑنے کی اجازت مل گئی ہے۔ لڑکوں کے گال دھوپ سے تمتما کر گوندنی سے بھی زیادہ سرخ ہو رہے ہیں۔ پسینے میں نہائے جا رہے ہیں۔ مگر ان کے گوندنی توڑنے کے انہماک میں فرق نہیں آیا ہے۔ اُدھر گوندنی ہے کہ ڈھیروں توڑی جا رہی ہے مگر اس میں کمی ہونے میں نہیں آتی۔

گوندنی توڑتے توڑتے جب کسی لڑکے کی نظر کسی بڑے بڑے دانوں والے گچھے پر پڑتی ہے تو وہ اسے اپنے جھولے کی بجائے اپنے منہ میں ڈال لیتا ہے۔ لڑکوں کے ہونٹوں پر گوندنی کے لیس دار رس کی تہہ جمی ہوئی ہے جو سوکھ کر سیاہی مائل پپڑی سی بن گئی ہے۔

نیچے ان پیڑوں کی چھاؤں میں جو اِکا دُکا آدمی رہ گئے ہیں، ان کا گھر ہے نہ گھاٹ۔ نہ کام کاج سے واسطہ نہ بھوک پیاس کی فکر۔ جسمانی آرام کو وہ ہر کام پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر کسی نے کچھ کھلا پلا دیا تو خیر ورنہ بھوکے پیاسے ہی پڑے رہے۔ دو ایک بیٹھے ہیں۔ دو ایک ذرا کمر سیدھی کرنے کو چٹائی پر لیٹ گئے ہیں۔ مگر گرمی کے مارے کھجوری پنکھا پل بھر کو نہیں رکتا۔ جب لیٹے لیٹے ذرا اونگھ گئے تو پنکھا ایک خاص زاویے پر پہنچ کر تھم گیا مگر ہاتھ سے چھوٹا نہیں۔ ایسے میں اگر کسی لڑکے کے ہاتھ سے گوندنی کا کوئی گچھا چھوٹ کر ان پر آ گرا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور لگے لڑکوں کو صلواتیں سنانے:

”نامرادو۔ بدذاتو! پل بھر کو تو چین لینے دو۔“

لڑکے دبی ہنسی ہنستے ہیں مگر جواب نہیں دیتے۔ ادھر وہ صاحب گچھے پر نظر ڈالتے ہیں جس کے کچھ دانے تو گچھے سے الگ ہو کر بکھر گئے تھے اور کچھ چوٹ کھا کر ساتھ ہی جڑے رہ گئے تھے۔ وہ صاحب انہیں چن کر اور ان کی مٹی پونچھ کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اور پھر پنکھا جھلنے لگتے ہیں۔

گوندنی والا تکیہ قصبے کے آخری سرے سے ذرا ہٹ کے واقع ہے۔ اس کے بعد غیر آباد علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ تکیے نے کوئی ڈیڑھ سو گز لمبی اور سو گز چوڑی زمین گھیر رکھی ہے۔ اس کے پچھواڑے کچھ اونچے

نیچے ٹیلے ہیں۔ ہر سال مستان شاہ کے عرس کے موقع پر جو ریچ کے مہینے میں منعقد ہوتا ہے بھنڈارے کی دیگیں ان ہی ٹیلوں کے آس پاس پکائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہاں کی زمین اور پتھر کالے پڑ جاتے ہیں اور سال بھر تک بھنڈارے کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔

تکیے کے بائیں طرف ایک کھلا میدان ہے جس میں ہری ہری گھاس اُگی ہوئی ہے۔ یہ چراگاہ بھی ہے اور لڑکوں کے کھیلنے کا میدان بھی۔ تکیے کی زمین نسبتاً اونچی ہے۔ دراصل پہلے اس جگہ بھی ٹیلے ہی تھے۔ مگر ان کو ہموار کر دیا گیا۔ تکیے میں گوندنی کے پیڑ زیادہ نہیں ہیں۔ بس یہی کوئی آٹھ دس، مگر ایک دوسرے کے پاس پاس۔ اس طرح کہ ایک کی شاخیں دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ اور یوں تکیے کا بیشتر حصہ ان کی چھاؤں میں رہتا ہے۔ ایک پیڑ کنویں کے اس قدر قریب ہے کہ اس کے پتے اکثر کنویں میں گرتے رہتے ہیں۔ مگر دن بھر میں اس کثرت سے پانی کنوئیں سے نکالا جاتا ہے کہ وہ ڈول میں پانی کے ساتھ باہر آ جاتے ہیں۔ ایک پیڑ مستان شاہ کی قبر پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ دو درخت اس جگہ ہیں جہاں نگینہ سائیں کی کوٹھڑی ہے اور چار پانچ وسط میں جہاں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے چٹائیاں بچھی رہتی ہیں۔

نگینہ سائیں کی کوٹھڑی تکیے کے سرے پر پچھواڑے کے قریب ہے۔ گوندنی کے دونوں پیڑ کچھ ایسے آگے پیچھے ہیں کہ ان سے اچھی خاصی اوٹ رہتی ہے اور نگینہ سائیں کی اکثر حرکات و سکنات لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

نگینہ سائیں اس وقت اپنی کوٹھڑی کے باہر ایک جھلنگی چار پائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اس کی کالی کملی اس کی کمر سے سرک گئی ہے۔ مگر اس کو کچھ پرواہ نہیں۔ وہ لمبا تڑنگا آدمی ہے۔ عمر پچاس پچپن کے پیٹے میں مگر ہاتھ پاؤں میں جوانوں کی چُستی ہے۔ اس کے جسم کا رنگ صندلی ہے۔ اس کے سڈول اعضاء اور بازوؤں کی مچھلیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اسے پہلوانی کا شوق رہا ہوگا۔ اب بھی بھی کبھی علی الصباح جب آس پاس کوئی نہیں ہوتا تو وہ بدن پر تیل مل کر دو چار ڈنڈ پیل لیا کرتا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی، جو ہر وقت مخمور رہا کرتی ہیں۔ بال لمبے لمبے گھنگریالے اور پھولے پھولے سے، ماتھے پر ایسے پڑے ہوئے جیسے ٹوپی پہن رکھی ہو۔ داڑھی مونچھ صاف۔ اس کے سراپا سے درویشی کا ایک خالص بانکپن ٹپکتا ہے۔

وہ اس وقت اپنے منکوں کی مالا میں نیا ڈورا ڈال رہا ہے۔ وہ بار بار ڈورے کے سرے کو بل دیتا اور اس میں منکوں کو پرونے کی کوشش کرتا ہے۔ پسینے کے لاتعداد قطرے اس کے جسم سے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے ہیں، اور اس کی کملی کو بھگو رہے ہیں مگر اسے کچھ خیال نہیں۔ اس کی کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اس پر گرمی کا کوئی اثر ہے۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اٹھا کر پیڑوں پر چڑھتے ہوئے لڑکوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتا ہے اور پھر منکوں کے پرونے میں لگ جاتا ہے۔

یہ منکوں کی مالا نگینہ سائیں کو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت منکے نفاست سے تراشے ہوئے، کوئی سرخ، کوئی سبز، کوئی سیاہ، کوئی سفید، کوئی نیلا، کوئی پیلا۔ اس نے یہ منکے برسوں میں جمع کیے تھے۔ ان کے رنگ قدرتی تھے اور پتھر بھی قیمتی۔ ایک مرتبہ ایک لڑکے نے شرارت سے اس مالا کو

کہیں چھپادیا۔ سائیں کو ایسا غم ہوا کہ کئی دن کھانا نہیں کھایا۔ آخر وہ لڑکا ڈر گیا اور جہاں اس نے مالا چھپائی تھی، نگینہ سائیں کو وہاں لے گیا۔ سائیں کو اس کے مل جانے کی ایسی خوشی ہوئی کہ اس نے لڑکے کو اسی وقت معاف کر دیا۔ بلکہ مٹھائی کھانے کو کچھ پیسے بھی دیئے۔

تھوڑی دیر میں نگینہ سائیں کو کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آنکھ اٹھا کے دیکھا تو قصبے کا بوڑھا بھانڈ علیا تھا جو اسی کی طرف آ رہا تھا۔ میلا سا تہمد، پھٹا ہوا کرتہ جس میں ایک بھی بٹن باقی نہیں رہا تھا اور اس کا سوکھا ہوا سیاہ سینہ نظر آ رہا تھا۔ جوتا پھٹا ہوا جس سے چلنے میں پاؤں کے تلوے نکل نکل جاتے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی جن میں زندگی کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ کلے پچکے ہوئے، کمر جھکی ہوئی، اس کی اس حالت کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ وہی قصبے کا مشہور علیا بھانڈ ہے جس کی بذلہ سنجی، زندہ دلی اور حاضر جوابی کے چرچے گھر گھر تھے اور جس کے لطیفے ہر چند کہ وہ کبھی کبھی اخلاقی قیود سے تجاوز کر جاتے تھے، پردے میں بیٹھنے والی بی بیاں تک ایک دوسرے کو سنایا کرتی تھیں۔

علیا ایک مدت سے کام کاج سے معذور ہو چکا تھا اس کے دو جوان بیٹے تھے جن کے ٹکڑوں پر وہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی بیوی مدت ہوئی مر چکی تھی۔ دونوں بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ جن کی اپنی تین تین چار چار اولادیں تھیں۔

یہ سارا کنبہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ گھر میں دو کوٹھریاں تھیں۔ ایک پر ایک بیٹے نے قبضہ جما رکھا تھا اور دوسری پر دوسرے نے۔ علیا کے لیے گھر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ رہنے کی تنگی کے علاوہ اسے یہ شکایت بھی تھی کہ بیٹے اس بڑھاپے میں اس کے آرام کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔

اس پرناداری نے اور بھی پتلا حال کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اسے ہر وقت بڑبڑاتے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ پھر بھی جب کبھی اس کی طبیعت لہرانے لگتی تو گھڑی دو گھڑی کے لیے اس کی پرانی زندہ دلی کی یاد تازہ ہو جاتی۔

ایک مرتبہ تکیے میں دو نوجوان گویے آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ بُرشی ٹوڈی، ٹوڈی ٹھاٹھ کا کون سا راگ ہے، اور اس کے سُر کیا ہیں۔ اتنے میں علیا کا اُدھر سے گزر ہوا۔ وہ ان کی بحث سن کر ٹھہر گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا:

"ارے بھائی! تم تو ناحق الجھ رہے ہو۔ آؤ ہم بتائیں۔ بُرشی ٹوڈی کے سُر کون کون سے ہیں۔ اور وہ کس طرح بنتی ہے۔ مشکل راگ ہے۔ آج کل لوگ ذرا کم ہی گاتے ہیں۔ بھیرویں میں اور اس میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بلکہ اس کی آروہی تو قریب قریب وہی ہے جو بھیرویں کی ہے۔ البتہ امروہی میں جب پنچم پر پہنچو تو رک جاؤ اور اس پر تھوڑا سا لیموں نچوڑ دو۔"

نگینہ سائیں نے علیا کو گرمی سے ہانپتے ہوئے دیکھا تو کہا:

"نہا کیوں نہیں لیتے بابا! سقاوے میں پانی ہے۔"

"کتنی دفعہ نہاؤں سائیں جی۔ دو دفعہ تو نہا چکا ہوں۔"

"اچھا تو حقہ بھر لو۔ چولھے میں آگ ہے۔ میں نے اُپلا ڈال دیا تھا۔"

علیا چولھے کی طرف گیا۔ جس کی راکھ سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

''آج کل کی اولاد ایک دم گولی مار دینے کے لائق ہے۔ علیا نے بُو بڑانا شروع کیا۔'' بڈھے باپ سے ایسا سلوک کرتے ہیں کہ کوئی نوکر سے بھی نہ کرتا ہوگا۔ دو وقت کھانا کیا دیتے ہیں، حاتم کی گور پر لات مارتے ہیں۔ میں نامرادوں کے پاس ٹِکتا ہی کب ہوں۔ بس دو نوالے زہر مار کئے اور پھر تکیے میں۔ کم بختوں میں میرا دل لگتا ہی کب ہے۔ تمبا کو کہاں ہے سائیں بادشاہو!''

''کوٹھڑی میں دیکھو۔ گڑ کی پوٹلی بھی وہیں ہوگی۔''

علیا کوٹھڑی کے اندر گیا۔ اس کے بڑبڑانے کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ گو الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اتنے میں اس پیڑ سے جو نگینہ سائیں کی چارپائی کے قریب تھا، ایک لڑکا نیچے اترا اور سائیں کے پاس جا کر اسے اپنا جھولا دکھانے لگا جس میں گوندنی بھری تھی۔ سائیں نے اس پر یونہی سی ایک نظر ڈالی اور کہا۔

''بس ٹھیک ہے۔ لے جاؤ۔''

علیا حقہ اٹھائے آ رہا تھا۔ لڑکے نے اسے دیکھ کر کہا!

''بابا علیا گوندنی چاہیے؟''

''جیتا رہ بیٹے! مجھے اپنے لیے تو نہیں چاہیے۔ میرے پوتے کے لیے تھوڑی سی دے دے۔''

لڑکے نے گوندنی کے گچھوں کی دو تین مٹھیاں بھر کے علیا کے پلے میں ڈال دیں۔

''شاباش ہے بھئی۔ جیتا رہے تو۔ کس کا بیٹا ہے تو؟''

''نورے کا۔''

''کون نورا؟''

''وہ جو گاڑی بان ہے۔''

''شاباش ہے بھئی۔ تُو بھی جیے۔ تیرا باپ بھی جیے۔''

نگینہ سائیں نے اپنی مالا پرو لی تھی۔ اور اسے گلے میں ڈال لیا تھا۔ وہ بڑا مگن معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی جھلنگی چارپائی سے اٹھا اور درختوں پر چڑھے ہوئے لڑکوں سے مخاطب ہو کے اونچی آواز میں کہنے لگا۔

''لو بھئی لڑکو اب بس کرو۔ نیچے اتر آؤ۔''

''اچھا سائیں جی!'' کئی لڑکوں کی آوازیں سنائی دیں۔

جب لڑکے پیڑوں سے نیچے اتر رہے تھے تو اچانک ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

''ارے مولو! دیکھ تو وہ کون آ رہا ہے۔''

''کہاں؟''

''وہ ادھر سڑک پر۔ وہ جس نے گیروے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ایک عورت بھی تو ساتھ ہے اس کے، برقع اوڑھے ہوئے۔''

''ارے یہ تو استاد فلک ہے۔ تو جانتا نہیں۔ ہمارے قصبے کا پنجابی شاعر!''

''وہی نا جس کی بیٹی پٹواری کے گھر میں رہتی ہے؟''

''ہاں ہاں وہی۔''

''اور وہ عورت؟''

''اس کا پتہ نہیں۔''

''تو آ جلدی سے نیچے اتر کے دیکھیں۔''

لڑکے جلدی جلدی گوندنی کے پیڑوں سے اترنے لگے۔ اور حسب قاعدہ نگینہ سائیں کے پاس جا جا کے، جو پھر اپنی جھلنگی چارپائی پر آ بیٹھا تھا، اپنی اپنی توڑی ہوئی گوندنی دکھانے لگے۔ سائیں بے پروائی کے انداز سے لڑکوں کے جھولوں پر سرسری نظر ڈال کے سر ہلا دیتا جس کا مطلب تھا کہ ٹھیک ہے۔

سب سے آخر میں ایک لڑکا پیڑ سے اترا جو اپنے لباس اور وضع قطع سے سب لڑکوں سے مختلف تھا۔ اس کی عمر پندرہ برس سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار اور قمیض پہنے تھا۔ سر پر انگریزی طرز کے تراشے ہوئے بال جو کچھ زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سے پسینہ بہہ بہہ کے اس کے چہرے کو تر بتر کر رہا تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور خدوخال میں موزونیت تھی، اس نے گوندنی نہیں توڑی تھی۔ یا کم از کم جمع نہیں کی تھی۔ اس کی بغل میں ایک کتاب تھی۔ پیڑ پر چڑھ کے گوندنی توڑنے سے کہیں زیادہ وہ کتاب کے مطالعے میں مصروف رہا تھا۔ اس کی وضع کہے دیتی تھی کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔

ادھر لڑکوں نے استاد فلک کو راستے ہی میں جا لیا تھا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

''چاچا فلک جی سلام! استاد فلک جی سلام!''

استاد جواب میں کہتا جاتا:

''جیو مینڈھا لال، جیو مینڈھا سائیں!''

استاد خدا بخش فلک قصبے کا مشہور پنجابی شاعر تھا۔ مگر وہ عموماً قصبے سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ گیروے رنگ کا ململ کا کرتہ، گیروے رنگ کا تہمد اور پگڑی بھی گیروے ہی رنگ کی۔ لمبا قد، دبلا پتلا جسم، سانولا رنگ، کھڑی موچھیں، جنہوں نے اس کے اوپر کے ہونٹ کو چھپا لیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں سرمے کے ڈورے، دہنے ہاتھ کی کلائی پر سیپ کے دانوں کی ایک تسبیح کو بل دے کر لپیٹ لیا تھا۔ بید کی چھڑی بھی اسی ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا ایک پرانا بیگ تھا جیسا کہ عموماً سیاسی دوا فروشوں کے پاس ہوتا ہے۔

اس کے ہمراہ جو عورت تھی قصبے کے کسی شخص نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کتھئی رنگ کا ریشمی برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ جس کے نقاب کو اس نے سر کے پیچھے الٹ رکھا تھا۔ وہ تھی تو ادھیڑ عمر مگر شہری عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کیے ہوئے۔ کانوں میں سونے کے چھوٹے چھوٹے جھمکے، ناک میں چھوٹی سی کیل جس میں سرخ نگینہ دمکتا ہوا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں دو دو تین تین قیمتی انگوٹھیاں۔ مگر گرمی کی شدت نے اس کے سارے بناؤ سنگھار پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں باریک بنت کا ایک چھوٹا سا

کھجوری پنکھا تھا جس کے حاشیے پر سرخ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ وہ اپنے چہرے اور سینے پر جلد جلد پنکھا جھلے جا رہی تھی۔ مگر پسینہ تھا کہ رکنے میں نہ آتا تھا۔ وہ گرمی کی شدت اور برقعے کے بوجھ سے ہانپتی جا رہی تھی۔ پسینے کے قطروں سے اس کا بہت سا غازہ اتر چکا تھا۔

اب لڑکوں کی ٹولی جس میں آٹھ دس سے کم لڑکے نہ ہوں گے۔ استاد فلک اور اس اجنبی عورت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تکیے کی طرف آ رہے تھے۔ لڑکے استاد کو دیکھ کر خوشی سے اچھل کود رہے تھے۔ ساتھ ساتھ استاد پر سوالوں کی بھرمار بھی ہو رہی تھی۔

''چچا فلک جی! اتنے دن کہاں غائب رہے؟'' ایک لڑکے نے پوچھا۔

''بھئی اب کے کچھ زیادہ ہی دن باہر رہنا پڑا۔''

''جلدی تو نہیں چلے جاؤ گے؟''

''نہیں۔ کچھ دن تمہارے پاس ہی رہوں گا۔''

''مشاعرہ ہوگا، نا؟''

''ہاں کیوں نہیں۔''

''نئے شعر لکھے ہیں نا؟''

''بھئی وہ تو میں لکھتا ہی رہتا ہوں۔''

''پھر تو مشاعرہ ضرور ہی ہوگا۔''

استاد لڑکوں کے ان سوالوں سے بیزار نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس عورت کے رُوبرو قصبے میں اپنی مقبولیت پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس نے برقع پوش عورت کی طرف جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی، پلٹ کر دیکھا اور فخریہ انداز سے کہا:

''یہ سب میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ جیو مینڈھے لال!''

مگر برقع پوش عورت پر استاد کی اس مقبولیت کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گرمی کی شدت سے ویسے ہی جان سے بیزار ہو رہی تھی۔ اس پر لڑکوں کا بار بار اسے ٹوہ لگانے والی نظروں سے دیکھنا اسے اور بھی پریشان کیے دے رہا تھا۔

تکیے کے دروازے پر، جو دو چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی شاخوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر بنایا گیا تھا، ان کی مڈبھیڑ اس کتاب والے لڑکے سے ہوئی۔ استاد فلک کو دیکھ کر اس لڑکے نے ادب سے کہا:

''چچا جی السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔ کون سلطان بابو۔ اوہوہو۔ ماشاء اللہ! جوان ہو گیا ہے اب تو میرا بابو۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا۔ اور آگے بڑھ کر اس لڑکے کو گلے سے لگا لیا اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''کہو چودھری جی کیسے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ سلطان کچھ جواب دے۔ وہ لڑکا جسے سب مولو مولو کہتے تھے، اور جس کے سر کے بال

بھورے تھے، بول اٹھا:

"تمہیں خبر نہیں چچا، چودھری جی تو فوت ہو گئے۔"

"جھوٹ!" استاد کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔" مولو نے کہا۔ "یقین نہ آئے تو بابو سے پوچھ لو۔"

اس پر استاد نے سلطان کی طرف دیکھا، جس نے اپنا منہ پھیر لیا تھا۔

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!" استاد نے رک رک کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یہ خبر سن کر واقعی سخت صدمہ ہوا ہے۔

"کب فوت ہوئے؟" اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر سلطان سے پوچھا۔

"پچھلے مہینے کی سترہ تاریخ کو۔ ابھی تو چالیسواں بھی نہیں ہوا۔"

"مرض کیا تھا؟"

برقع پوش عورت کو اب اور زیادہ صبر کی تاب نہ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تو دھوپ ہی میں کھڑی رہی تھی۔ مگر جب دیکھا کہ بات طول ہی پکڑتی جا رہی ہے تو خود ہی تکیے کے اندر چلی گئی اور گوندنی کے پیڑ کی چھاؤں میں کنوئیں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ گرمی نے اسے سخت نڈھال کر دیا تھا۔ اسے استاد فلک پر بھی رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

نگینہ سائیں نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی کملی سنبھالتا ہوا چارپائی سے اٹھا اور اس کے قریب پہنچا۔

"آؤ بی بی۔" اس نے کہا "ادھر چھاؤں میں چارپائی پر جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ عورت سائیں کی سرخ سرخ مخمور آنکھیں دیکھ کر پہلے تو گھبرائی مگر جلد ہی سنبھل گئی۔

"سائیں جی۔" اس نے کہا۔ "خدا آپ کا بھلا کرے۔ تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔ پیاس سے حلق سوکھا جا رہا ہے۔"

"بی بی تم چل کے وہاں بیٹھو۔ میں ابھی کنوئیں سے تازہ ٹھنڈا پانی نکال کے لاتا ہوں۔"

اس پر برقع پوش عورت نے تکیے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ جس کے پاس استاد فلک ابھی تک لڑکوں سے باتوں میں مشغول تھا۔ اور وہ اٹھ کر تکیے کے اس طرف چل دی جہاں نگینہ سائیں کی چارپائی پڑی تھی۔

سلطان بابو استاد فلک سے کہہ رہا تھا:

"کچھ پتہ نہیں چلا کہ ابا جی کو بیماری کیا تھی۔ بس رات کو عشاء کی نماز پڑھ کے گھر آئے تو کہنے لگے، بڑی گرمی لگ رہی ہے، میرا پلنگ اوپر چھت پر بچھا دو۔ ہم نے بچھا دیا۔ کہنے لگے۔ افوہ یہاں بھی بہت گرمی ہے۔ ہم نے پنکھا جھلنا شروع کیا۔ پھر کہنے لگے حقہ بھر لاؤ۔ ہم حقہ بھر لائے۔ مگر ایک ہی کش لگا کے چھوڑ دیا۔ پھر کہنے لگے۔ طبیعت زیادہ گھبرانے لگی ہے۔ اس پر چاچا جی حکیم صاحب کو بلا لائے۔ حکیم صاحب

نے عرق اور دوا کی پڑیا دی۔ اس سے کچھ افاقہ ہوا۔ اور وہ سو گئے۔ ہم لوگ بھی بے فکر سے ہو گئے۔ مگر رات کو دو بجے کے قریب اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ کہنے لگے دم گھٹا جا رہا ہے۔ سینے پر سخت بوجھ ہے۔ پھر کہنے لگے۔ جی متلا رہا ہے۔ متلی ہو جائے تو طبیعت صاف ہو جائے۔ مگر متلی نہیں ہوئی۔ اس پر چاچا جی پھر حکیم صاحب کو بلانے دوڑے۔ مگر جب تک حکیم صاحب آئیں، ابا جی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔"

استاد فلک نے گہرا سانس لیا۔

"خدا غریقِ رحمت کرے۔ عجب فرشتہ خصلت انسان تھے۔

پچھلے سال جب میں رخصت ہونے لگا تو کس قدر محبت سے گلے ملے تھے۔"

یہ کہتے کہتے استاد کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ "ہائے مجھے کیا خبر تھی کہ مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات ہوگی۔"

اس نے پگڑی کے سرے سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ جن میں سے سرمہ بہہ نکلا تھا اور پگڑی پر سیاہ دھبہ پڑ گیا تھا۔ اچانک اسے برقع والی عورت یاد آئی۔ جلدی سے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ مگر وہ نظر نہ آئی۔ اس پر وہ لڑکوں کو وہیں چھوڑ تکیے کے اندر لپکا۔ کنویں پر اسے نگینہ سائیں نظر آیا جو کنویں سے پانی نکال رہا تھا۔ اور وہ وہیں ٹھہر گیا۔

"سلام علیکم سائیں بادشاہو!" اس نے کہا۔

"آؤ جی۔ استاد فلک جی! بہت دنوں کے بعد صورت دکھائی۔ خیریت سے تو ہو۔"

"شکر ہے مالک کا۔ غنیمت ہے جو دم گزر جائے۔" پھر کسی قدر تامل کے بعد کہا۔ "سائیں جی! میرے ساتھ ایک بی بی آئی تھی۔ آپ نے اسے تو نہیں دیکھا؟"

"ہاں ہاں وہ سامنے چارپائی پر بیٹھی ہے۔ پیاس سے برا حال ہے بیچاری کا، میں اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال رہا ہوں۔ تم بھی وہیں جا کر بیٹھو۔ بابا علیا نے ابھی ابھی حقہ بھرا ہے۔ میں ابھی لوٹے میں پانی لے کر آتا ہوں۔"

"پٹواری صاحب تو اچھے ہیں نا؟"

"ہاں اچھے ہیں۔"

"اور میری بیٹی بھی خیریت سے ہے۔"

"ہاں وہ بھی خیریت سے ہے۔ ابھی کل ہی میں نے اسے دیکھا تھا جب وہ پانی بھرنے آئی تھی۔ ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گئی ہے۔"

"کرم ہے مولا کا۔ میری کیا ہستی ہے۔"

یہ کہہ کر استاد فلک اس طرف چل دیا، جدھر وہ عورت غصے میں بھری چارپائی پر بیٹھی تھی۔

اب سورج کی حدت میں زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ اور وہ عین سر پر سے ہٹ کے مغرب کی سمت نیچا ہونے لگا تھا۔ گوندنی کے پیڑوں کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے اور قصبے کے لوگ جو کھانا کھانے یا کسی اور کام کے لئے چلے گئے تھے، رفتہ رفتہ واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں تیتر کا پنجرہ تھا تو کوئی

بیٹھے ہوئے تھا۔ بعض کو تاش کھیلنے یا شطرنج کی بساط بچھانے کی لگی تھی۔ ادھر وہ لوگ جو پیڑوں کے نیچے چٹائیوں پر دراز تھے۔ اب اٹھ بیٹھے تھے۔ اور کنوئیں کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ کوئی کنوئیں سے پانی نکال کر خود بھی پی رہا تھا، اور دوسروں کو بھی پلا رہا تھا۔ کوئی سقاوے میں گھس گیا تھا۔ کچھ دیندار لوگ مٹی کے لوٹوں میں پانی بھر کر ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہے تھے۔

برقع پوش عورت کو کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پینے او ہاتھ منہ دھونے سے خاصا قرار آ گیا تھا۔ جس جگہ وہ چارپائی پر بیٹھی تھی اس سے کچھ ہٹ کے ایک دوسرے گوندنی کے پیڑ کے نیچے استاد فلک، بابا علیا اور نگینہ سائیں چٹائی پر اکڑوں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ استاد فلک کہہ رہا تھا:

''ہم لوگ پہلے سرائے میں اترے تھے۔ مگر کوٹھڑیاں ذرا گندی تھیں۔ میں نے بھنگی کو بلوا کے صاف کرنے کو کہہ دیا ہے۔ اتنے میں وہ صاف کرے، میں نے سوچا کہ ذرا تکیے میں چل کر سائیں بادشاہ کو سلام کر آؤں اور کنویں کا پانی بھی پی لوں۔ ہائے کیسا ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہے۔ ہمارے کنویں کا۔ خدا کی قسم جب تک باہر رہتا ہوں، اس پانی کو ترستا رہتا ہوں۔''

''استاد یہ بی بی کون ہے......؟'' اچانک بابا علیا نے کھانستے اور حقے کی نے کو استاد فلک کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''استاد نے پہلے بابا علیا اور پھر نگینہ سائیں کی طرف دیکھا۔ پھر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''شہر کے ایک بڑے ٹھیکے دار کی بیوہ ہے۔ بڑے عزت دار لوگ ہیں۔ ہزاروں کی جائیداد ہے۔''

''یہاں کیسے آنا ہوا؟'' بابا علیا نے دوسرا سوال داغ دیا۔

استاد نے قدرے تامل کیا۔ پھر کہا۔

''ذرا لمبا قصہ ہے۔ ان خاتون کو سرائے میں چھوڑ آؤں تو پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا اور برقعے والی عورت کے پاس جا کر کہنے لگا۔

''چلو اب سرائے میں چلیں۔ بھنگی نے کوٹھڑیاں صاف کر دی ہوں گی۔

اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔ لوگ آتے جا رہے ہیں۔

عورت نے کچھ جواب دیا۔ اس کی خفگی ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے برقعے کو ٹھیک سے سر پر رکھا اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور استاد حتی الامکان اسے لوگوں کی نظروں سے بچاتا، تیز تیز قدم اٹھاتا تکیے سے نکال لے گیا۔

اور سب لڑکے تو اپنی اپنی گوندنی لے کر گھر چلے گئے تھے مگر سلطان بابو اور بھورے بالوں والا لڑکا مولو ابھی تک تکیے ہی میں موجود تھے۔ وہ کنویں کے قریب ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے۔ سلطان درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ اور مولو مٹی کے ایک آبخورے سے جس میں گوندنی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بھگو دیا گیا تھا، گچھے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی گوندنی سے لبالب بھرا ہوا ایک اور آبخورہ بھی تھا۔ مگر وہ اس کے کسی گچھے کو ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔

سلطان اور مولو قریب قریب ہم عمر تھے مگر کھیتوں میں سخت محنت کرنے کے باعث مولو سلطان سے

زیادہ توانا تھا۔ اس کا قد بھی نکلتا ہوا تھا۔ شکل وصورت میں بھی وہ سلطان سے برا نہیں تھا۔ مگر اس کے خدوخال میں وہ جاذبیت نہ تھی جو قدرت نے سلطان کو عطا کی تھی۔ مولو اپنے گاڑھے کے کُرتے اور تہمد میں پورا پورا دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا مگر کھیتی باڑی کے کام میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اچھی اور بری زمین کی پہچان، ہل کس طرح جوتا جاتا ہے، بیج کس طرح بوتے ہیں، کیاریوں کو پانی کس طرح دیتے ہیں، فصلیں کیونکر کاٹی جاتی ہیں، ان سب باتوں کی اسے پوری پوری واقفیت تھی۔

وہ سلطان کی عزت کرتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ سلطان امیر گھرانے کا لڑکا یا پڑھا لکھا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ سلطان کے ہمدردانہ سلوک اور اس کی خوش مزاجی کا بچپن ہی سے گرویدہ ہو گیا تھا۔

سلطان کبھی کبھی کتاب سے نظر ہٹا کر مولو سے ایک آدھ بات کر لیتا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو جاتا۔ اس نے مولو سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ دوسرا آبخورا کس کے لئے الگ رکھ دیا گیا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کس کے لئے ہے اور شام کے جھٹ پٹے میں جب محلے کی لڑکیاں اپنے مٹکے لے کر تکیے کے کنویں پر پانی بھرنے آئیں گی تو وہ چپکے سے کس کو دے دیا جائے گا۔

استاد خدا بخش فلک کے باپ دادا آڑھت کا کاروبار کرتے تھے۔ قصبے میں ان کی چھوٹی سی دکان تھی۔ جب خدا بخش کی عمر پانچ چھ برس کی ہوئی تو باپ نے اسے محلے کی مسجد میں پڑھنے کو بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک آدھ برس میں جب اس نے بغدادی قاعدہ ختم کر لیا تو باپ نے اسے اپنے آبائی کام پر لگانا چاہا۔ مگر نہ تو اس کا جی اس کام میں لگتا، نہ دکان ہی پر بیٹھتا۔ اس پر باپ آئے دن تھپڑوں اور جوتوں سے اس کی خبر لیتا۔ مگر مار پیٹ سے اس کی اصلاح نہ ہوئی۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑتا گیا۔ اس طرح اس کی عمر دس گیارہ برس کی ہو گئی۔

ایک دن باپ نے اس کے نکمے پن پر ڈنڈے سے اس کی خوب مرمت کی اور طیش میں آ کر اسے گھر سے بھی نکال دیا۔ باپ کا خیال تھا کہ چار پانچ گھنٹے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر واپس آ جائے گا۔ جیسا کہ پہلے آ جایا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ واپس نہ آیا۔ وہ سیدھا قصبے کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور جو پہلی گاڑی بھی پلیٹ فارم پر آ کر رکی، اس میں سوار ہو گیا۔ اتفاق سے یہ گاڑی لاہور جانے والی تھی۔ اور وہ ٹکٹ چیکروں کی نظر سے بچتا، چُھپتا چُھپاتا، جیسے تیسے لاہور پہنچ گیا۔

آوارگی کے پہلے چند مہینوں میں اس نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ کئی کئی دن بھوکا رہا۔ مگر نہ تو اس نے گھر جانے کا نام لیا اور نہ ماں باپ کو کوئی خط ہی بھیجا۔ اس سے کوئی پوچھتا تو وہ خود کو یتیم ظاہر کرتا۔ پیٹ بھرنے کے لئے اسے کئی دھندے کرنے پڑے۔ کئی گھروں میں ملازم ہوا۔ مگر اس کی آزاد طبیعت نے ایک دو مہینے سے زیادہ کہیں ٹکنے نہ دیا۔ ایک مرتبہ ایک یتیم خانے میں بھی نام لکھوا لیا۔ اور اس کے منتظم کا دیا ہوا بند گلے کا کالا کوٹ اور ترکی ٹوپی پہن کر یتیم خانے کے لیے چندہ جمع کرنے لگا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کام سے بھی اس کا جی اُچاٹ ہو گیا۔

وہ چندے کے پیسے زیادہ تر خود ہی کھا پی کے اُڑا دیتا، اور شام کو جب ڈرتے ڈرتے یتیم خانے میں پہنچتا تو منتظم ہنٹر سے اس کی خوب کھال اُدھیڑتا۔ پھر بھی جیسے تیسے اس نے دو سال وہاں گزار ہی دیے۔

اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اسے اردو خاصی لکھنی پڑھنی آ گئی۔

یہ لاہور کا وہ زمانہ تھا۔ جب پرانی تہذیب پر نئی روشنی کے اثرات پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اور لوگوں کے رہن سہن، لباس، وضع قطع اور عادات و اطوار میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی جا رہی تھی۔ آئے دن مغرب میں نئی نئی ایجادیں ہو رہی تھیں۔ اور انگریزی عملداری کی بدولت ہندوستان والے بھی اپنی اپنی مرضی سے یا اپنی مرضی کے خلاف ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ ادھر ملک میں قدامت پسندوں کی ایک کثیر تعداد ایسی تھی، جو ہر نئی چیز کی خواہ وہ مفید ہی کیوں نہ ہو، مخالفت پر تلی رہتی تھی۔

اس کام میں پنجابی زبان کے شاعر بھی خاص طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ لوگ جب کبھی کسی نئی چیز کو رواج پاتے ہوئے دیکھتے تو فوراً اسے شعر کا موضوع بنا لیتے۔ جب لاہور شہر کی سڑکوں کو بجلی کے کھمبوں سے آراستہ کیا گیا تو کسی پنجابی شاعر نے جھٹ اس پر نظم لکھ ڈالی:

''باؤ جی بجلی آئی اے
جدی چند وانگن رُشنائی اے''

بائیسکل کا رواج ہوا تو اسے ''شیطانی چرخہ'' کہہ کر اس کا مذاق اڑایا گیا اور دل کے پھپھولے پھوڑے گئے۔

چونکہ یہ نظمیں چار یا چھ صفحوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھیں اس لیے نہ تو ان کی چھپائی میں دیر لگتی اور نہ کچھ خرچ ہی زیادہ آتا۔ ایسی کتابیں آئے دن کثرت سے نکلتی رہتیں۔ لوگ انہیں سستے داموں کتب فروشوں سے خرید لاتے، اور دن بھر شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گا گا کر انہیں بیچتے پھرتے۔

''بابو جی بن گئے، جنٹل مین''
''میں اے بی سی پڑھ گئی آں
انارکلی وچ وڑ گئی آں''
''لے لو دو دو پیسے۔''

یتیم خانے سے نکلنے کے بعد خدا بخش کو یہ کام اپنی طبیعت کے بہت موافق معلوم ہوا۔ اس نے ایک ایسے ہی گا گا کر قصے بیچنے والے سے دوستی پیدا کر لی۔ اس کی آواز قدرتی طور پر سریلی تھی۔ چند روز کی مشق سے اس میں اور بھی لوچ پیدا ہو گیا اور وہ قصہ فروش کی سنگت میں گا گا کر کتابیں بیچنے لگا۔ کوئی چھ مہینے تک دونوں کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد خدا بخش نے اپنا الگ دھندا شروع کر دیا۔ اسے سب ٹھکانے معلوم ہو چکے تھے۔ کتب فروشوں سے جا کر کتابیں لے آتا اور لاہور اور اس کے آس پاس کے قصبوں میں گا گا کر بیچتا پھرتا۔ اسی طرح دو برس اور گزر گئے۔

اپنے ڈھب کا کام ملا تو طبیعت کے جوہر آپ سے آپ کھلنے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے مصرعے موزوں ہونے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے خود ایک پنجابی نظم لکھ کر چھپوا ڈالی۔ گو اس نظم کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی، مگر وہ مایوس نہ ہوا اور اگلی دفعہ زیادہ محنت اور کوشش سے ایک اور نظم کہی۔ اور اس میں اپنا تخلص فلک رکھا۔ یہ ایک جاٹ اور جاٹنی کا مکالمہ تھا۔ جاٹنی کہتی تھی کہ مجھے جوتی لے دو جس میں ستارے

ٹکے ہوں۔ مگر جاٹ کہتا تھا کہ میں تو تمہیں کالے سلیپر لے کر دوں گا۔ جوتیوں کا پہننا تو اب پرانی بات ہو گئی ہے۔

اس مزاحیہ نظم کی دُھن خدا بخش نے خود ہی باندھی تھی جو بڑی چلتر تھی۔ اس نظم کو اس کی امید سے کہیں بڑھ کے کامیابی ہوئی۔ چند ہی روز میں اس کی سینکڑوں کاپیاں چھپ کر بک گئیں اور ہر طرف اس کا چرچا پھیل گیا۔ لڑکے اسکول سے چھٹی پا کر گھر آتے تو راستے بھر یہی گیت ان کی زبان پر ہوتا۔ رات گئے تانگے والے خالی جا رہے ہوتے تو یہی دھن رات کی خاموشی کو توڑتی ہوئی سنائی دیتی۔

رفتہ رفتہ شہر کی گانے والیوں سے اس گانے کی فرمائش ہونے لگی۔ ایک گراموفون کمپنی کے ایجنٹ نے خدا بخش کو ڈھونڈھ نکالا اور اسے معقول معاوضہ دے کر اپنی کمپنی کے لئے اس پنجابی گانے کے حقوق حاصل کر لئے۔

خدا بخش کو اس نظم سے اس قدر روپیہ ملا کہ اس نے بازاروں میں گا گا کے قصے بیچنا چھوڑ دیا۔ وہ اب مزاحیہ نظمیں اور قصے لکھ کے کتب فروشوں کے پاس لے جاتا جو ہاتھوں ہاتھ اس کے مسودے خرید لیتے۔ رفتہ رفتہ اس نے پنجابی زبان کے مشاعروں میں بھی شریک ہونا شروع کر دیا۔ اس لذت کی اور ہی کیفیت تھی۔ ایک وقت میں سینکڑوں اشخاص کے سامنے شعر پڑھنا اور ان سے داد وصول کرنا ایک نشے کا سا اثر رکھتا تھا جس کے چسکے میں وہ ہر وقت ڈوبا رہنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں پنجابی کے نئے شاعروں میں اس کا نام امتیاز سے لیا جانے لگا۔

اب اسے اپنے قصبے سے نکلے آٹھ دس برس ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں لاہور میں اس کی ملاقات اپنے قصبے کے کئی لوگوں سے ہوئی تھی۔ اور کئی لوگوں نے اسے مشاعروں میں شعر پڑھتے ہوئے بھی سنا تھا۔ قصبے میں واپس آ کر ان لوگوں نے خدا بخش کے باپ کو اس کے بیٹے کی کامیابی کا حال سنایا تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ مگر جب ان لوگوں نے خدا بخش کی چھپی ہوئی نظمیں اسے دکھائیں تو اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ اس نے کہا:

''ہمارے خاندان میں آج تک کوئی نالائق پیدا نہیں ہوا تھا، پھر خدا بخش کیسے خاندان کی عزت کو بٹا لگاتا۔''

اس نے اسی روز اس کتب فروش کی معرفت جس نے یہ نظمیں چھاپی تھیں، اپنے بیٹے کو ایک نہایت شفقت آمیز خط لکھا۔ جس میں اس کے سارے قصور ایک دم معاف کر دیئے گئے اور اس سے ملنے کے لیے انتہائی اشتیاق کا اظہار کیا۔ مگر خدا بخش نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ اسے قصبے میں جانے کی کوئی خواہش نہ تھی۔

ایک مدت کے بعد اسے ماں کی طرف سے ایک خط ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ تمہارا باپ سخت بیمار ہے۔ بچنے کی امید نہیں۔ آخری بار شکل دیکھنی ہو تو فوراً آ جاؤ۔

اس مرتبہ اسے مجبوراً جانا پڑا۔ باپ بھی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے آنے ہی کا منتظر تھا۔ جیسے ہی بیٹے کی صورت دیکھی ہچکی لی اور چل بسا۔

باپ کی بیماری کے دوران اس کی آڑھت کی دکان اس کے دو پرانے ملازموں نے سنبھال رکھی تھی۔ خدا بخش نے دکان تو اپنے قبضے میں لے لی۔ مگر کاروبار ان ملازموں ہی پر چھوڑے رکھا۔ کیونکہ اس کا قصبے میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ بات اس کی بوڑھی ماں کو معلوم ہوئی تو اس نے بہت واویلا مچایا۔ اس نے کہا:

''میں بھی چند روز ہی کی مہمان ہوں۔ مگر مجھے حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے تمہارا سہرا دیکھ لوں۔ تمہارے باپ کے اٹھ جانے سے میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ گھر سونا لگتا ہے۔ بہو کے آ جانے سے کم سے کم ہم ایک سے دو تو ہو جائیں گے۔ پھر تمہارا جہاں جی چاہے چلے جانا۔''

اپنی آوارہ گردی کے دوران خدا بخش کو عورت ذات سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مگر اس کا شاعرانہ تخیل صنفِ نازک کے پیکر سے خالی بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

ماں نے اسی روز سے اس کے رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ اسے جلد ہی ایک لڑکی مل گئی جو تھی تو یتیم مگر تھی خاصی قبول صورت اور نوعمر اور یوں چند ہی روز میں خدا بخش کا گھر آباد ہو گیا۔ متاہل زندگی کی خوشیوں نے ان تکلیفوں اور مصیبتوں کی یاد کو بڑی حد تک اس کے ذہن سے محو کر دیا جو بچپن سے لے کر جوانی تک اس پر گزری تھیں اور وہ قصبے ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی سوچنے لگا۔ وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتا۔ کبھی کبھی دکان پر بھی چلا جاتا۔ جسے اس کے کارندے ابھی تک چلائے جا رہے تھے۔

اسی طرح دو برس گزر گئے۔

اس عرصہ میں اس نے چار پانچ مرتبہ لاہور کا چکر بھی لگا لیا۔ اس کے یہ دورے یا تو نئی نظمیں چھپوانے کے سلسلے میں ہوتے تھے یا مشاعروں میں شرکت کی غرض سے۔ کیونکہ اب اسے پنجابی کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کاموں سے اسے جو رقم وصول ہوتی اور دکان سے جو آمدنی ہوتی اس سے اس کی خوب گزر ہونے لگی تھی۔

اسی زمانے میں وہ ایک ننھی منی خوب صورت بچی کا باپ بھی بن گیا تھا جس سے اس کی گھریلو خوشیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے قصبے میں خود بھی مشاعرے منعقد کرنے شروع کر دیئے تھے جن میں کبھی کبھی باہر سے بھی دو چار شاعر بلوا لیے جاتے تھے۔ اور اس طرح گوندنی والے تکیے میں دو ایک روز بڑی چہل پہل رہنے لگی تھی۔

وہ اپنی متاہل زندگی سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا اور شاید اس کی آوارہ گردی کی عادت ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتی۔ مگر اس کی تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ جب اسے قصبے میں رہتے ہوئے تین چار برس ہو گئے تو ایک دن اچانک اس کی بیوی سیڑھیوں سے گر پڑی۔ ویسے تو شاید یہ واقعہ مہلک ثابت نہ ہوتا مگر اس کی بیوی عنقریب دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس حادثے سے بچہ ضائع ہو گیا اور ماں بھی جانبر نہ ہو سکی۔

اس سانحہ سے خدا بخش کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ کئی دن تک دیوانہ سا قصبے میں پھرتا رہا۔ تکیے میں بھی اس کا دل نہ لگتا۔ آخر ایک روز بچی کو اس کی دادی کے پاس چھوڑ لاہور چلا آیا۔ وہ ہر مہینے کچھ

روپے گھر بھیج دیتا۔ اور کبھی کبھار خود بھی قصبے میں جا کر اپنی ماں اور بچی کو دیکھ آتا۔

وہ لاہور ہی میں تھا کہ ایک دن اسے اپنے قصبے کے پٹواری کا خط ملا جس میں اس نے خدا بخش کو لکھا تھا کہ تمہاری ماں فوت ہو گئی ہے اور تمہاری بیٹی مہتاب کو جس کا قصبے میں کوئی والی وارث نہ تھا، میری بیوی اپنے گھر لے آئی ہے۔ تم آ کر اس کی پرورش کا انتظام کرو۔ اس پر خدا بخش قصبے میں پہنچا۔ اس نے اپنی ماں کے مرنے کا بہت غم کیا۔ اس کی آڑھت کی دکان اس کی ماں کی بیماری کے دوران ہی میں بک گئی تھی۔ اس نے پٹواری کی منت خوشامد کی کہ آپ مہتاب کو اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں حسب مقدور کچھ نہ کچھ خرچ بھیجتا رہوں گا۔ اس وقت لڑکی کی عمر چار برس کی تھی۔

بدقسمتی سے ان دنوں لاہور میں خدا بخش کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ یہ اقتصادی کساد بازاری کا زمانہ تھا۔ دفتروں میں ملازموں کی تنخواہوں میں دس فی صد کی تخفیف کر دی گئی تھی۔ ہر طرف بے روزگاری پھیل رہی تھی۔ ہر شخص اشیاء کی گرانی پر نالاں تھا۔ ایسے میں شاعری کی کسے سوجھتی اور خدا بخش کا تو شاعری کے سوا اور کوئی سہارا ہی نہ تھا۔ اس کا اپنا گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا۔ بیٹی کا خرچہ کہاں سے بھیجتا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور روزی کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ سنیاسی دوا فروش کا روپ دھار اجائے۔ بلا سے لوگوں کو شاعری کی ضرورت نہ رہی ہو۔ مگر وہ اپنی تندرستی کی طرف سے کیونکر غافل رہ سکتے ہیں۔

اس کام میں خوبی یہ تھی کہ یہ بھی اس کے حسب منشاء تھا۔ نہ کسی کی غلامی، نہ کوئی پابندی۔ البتہ اس پیشے کی خصوصیات شاعری سے مختلف تھیں۔ اس میں ذہن کی رسائی اور آواز کی بلند آہنگی کے ساتھ ساتھ بعض اور لوازمات کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے اس قسم کے سنیاسی دوا فروشوں کو اپنا کاروبار چلاتے دیکھا تھا۔ بلکہ وہ خود ان کے مجمعوں میں دیر تک کھڑا ان کی تقریریں سنتا اور ان کی حرکات کو دیکھتا رہا تھا۔ مشاہدے نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر شاعری کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی حکمتِ عملی، تھوڑی مجذوبیت، کچھ شعبدہ بازی اور تھوڑا بہروپیا پن شامل کر لیا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔

چنانچہ خدا بخش نے گیروا لباس پہن لیا۔ ہاتھ میں تسبیح لے لی۔ ایک بیگ میں کچھ روغن اور دواؤں کی شیشیاں بھر لیں۔ اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر فی سبیل اللہ خلق خدا کی خدمت شروع کر دی۔ منافع حرام، دوا کی قیمت اتنی کم کہ بس شیشی اور اشتہار کے دام نکل آئیں۔ اس کے اشعار لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لانے اور مجمعوں کی تعداد بڑھانے میں خاصے مد ثابت ہونے لگے۔

اس نئے کاروبار کے ساتھ ساتھ وہ مشاعروں میں بھی برابر حصہ لیتا رہا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے کلام میں مزاح اور ظرافت کے بجائے معرفت کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ کبھی مشاعرے میں شعر پڑھتے ہوئے یکبارگی اس پر جذب و کشف کا عالم طاری ہو جاتا۔ آواز بھرا جاتی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آتے۔

ان مشاعروں کی شرکت سے علاوہ داد و تحسین کے اپنے دواؤں کے کاروبار میں بھی خاصی مدد ملنے لگی۔ اور اب اس کا ہاتھ پہلے جیسا تنگ نہ رہا۔

جس وقت استاد فلک دوبارہ تکیے میں پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا اور سورج کی آخری کرنیں درختوں کی پھننگوں پر سے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اس وقت تکیے میں کسی قدر خنکی ہو گئی

تھی۔ کیونکہ نگینہ سائیں، بابا علیا اور قصبے کے تین چار نوجوانوں نے کنویں سے پانی نکال نکال کر تکیے کی زمین پر خوب چھڑکاؤ کر دیا تھا اور اوپر دوبارہ چٹائیاں بچھا دی تھیں جن پر بیٹھنے سے زمین کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔

تکیے میں اس وقت خوب چہل پہل تھی۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تاش، چوپڑ، شطرنج وغیرہ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کہیں بٹیروں کو ہاتھ میں لے لے کر آنکا جا رہا تھا۔ ان کی چونچ کی ساخت اور پنکھ کی پتلی خاص طور پر بٹیر بازوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کہیں من چلے نوجوان کلائی پکڑنے میں اپنا زور دکھا رہے تھے۔ ایک طرف حسینی خاں سارنگی نواز درخت سے ٹیک لگائے ملتانی بجا رہے تھے۔ کبھی کبھی پیڑ کی شاخ سے لٹکے ہوئے کسی پنجرے میں سے جس کی بانس کی سلائیوں میں آرائش کے لیے سفید اور فیروزی رنگ کے منکے پرو دیے گئے تھے، یکبارگی تیتر ''سبحان تیری قدرت'' کی رٹ لگانے لگتا تھا۔

ان سب سے الگ تھلگ تکیے کے ایک گوشے میں درختوں کی تنوں کی اوٹ میں نگینہ سائیں کے تین چار چیلے سبزی گھوٹنے میں مشغول تھے۔ وہ سونٹے کی تال کے ساتھ ساتھ دبی آواز میں دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل بھی گنگناتے جا رہے تھے۔ جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اس کلام میں سے ہے جسے سرکارِ انگریزی نے ضبط کر لیا تھا۔

دمدمے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی
اے ظفر بس ہو چکی تلوار ہندوستان کی

استاد فلک کے تکیے میں قدم رکھنے کی دیر تھی کہ ہر طرف اس کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ قصبے والوں کو اس کے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ اور یہ بات بھی گھر گھر پھیل گئی تھی کہ ایک پراسراری اجنبی عورت اس کے ہمراہ ہے جس کو سرائے میں ٹھہرایا گیا ہے چنانچہ بہت سے لوگ استاد سے ملنے اور اس بھید کی ٹوہ لینے کے لئے تکیے میں آ موجود ہوئے تھے۔

....

استاد فلک حسب معمول سر سے پیر تک گیروے رنگ کا لباس پہنے تھا۔ شانوں پر زلفیں بکھری ہوئی، چہرے پر جلالی کیفیت، تکیے کے کنویں تک پہنچتے پہنچتے اس کے گرد خاصا ہجوم ہو گیا تھا۔ وہ کسی سے بغل گیر ہوتا، کسی سے مصافحہ کرتا، کسی کا گال تھپتھپاتا، کبھی آہ سرد بھرتا، کبھی پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھتا، جذب و کشف کی ادائیں دکھاتا، جھومتا جھامتا آ رہا تھا۔

اچانک وہ رک گیا اور تکیے میں چاروں طرف متجسس نظریں ڈالنے لگا۔ اس نے جلد ہی قصبے کے پٹواری کو ڈھونڈ لیا۔ جو ایک گروہ میں بیٹھا شطرنج کھیلنے میں مصروف تھا۔ ادھر اب پٹواری نے بھی استاد فلک کو دیکھ لیا تھا۔ اور وہ کھیل چھوڑ کر اس سے مصافحہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

استاد فلک نے بلند آواز میں جیسے وہ کسی بڑے مجمع سے خطاب کر رہا ہو، کہنا شروع کیا:

''شکر ہے اس ربِ لایزل کا جس نے ایک لفظ ''کن'' سے کل کائنات عالم کو پیدا کیا۔ اور لاکھ لاکھ

احسان ہے اس سرکارِ دو عالم کا جس کے متعلق ارشاد کیا گیا اگر تو نہ ہوتا تو یہ ساری موجودات بھی نہ ہوتیں۔ اس کمترین بندۂ خدا، حقیر پُر تقصیر کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ ایک بار پھر اس سرزمین کو جو اس کا جنم بھوم ہے، اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائے......"

مجمعے سے ذرا ہٹ کے ایک شخص چھ سات برس کے ایک لڑکے کو کاندھے پر بٹھائے کھڑا تھا۔ لڑکا بڑی حیرت سے اس ساری کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک اس شخص سے پوچھا:

"ابا! استاد فلک اولیاء ہے؟"

باپ نے کچھ جواب نہ دیا۔

"ابا! اولیاء کیا ہوتا ہے؟" لڑکے نے پھر پوچھا۔

باپ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

اس پر لڑکے نے کچھ دیر چپ رہ کر پھر سوال کیا۔

"ابا! جب استاد فلک مر جائے گا تو اس کی قبر تکیے میں بنائیں گے۔"

باپ نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔

اُدھر استاد فلک اب قصبے کے پٹواری سے جس کا نام شمس الدین تھا اور عمر پچاس پچپن کے پیٹے میں تھی بڑی گرم جوشی سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"پٹواری جی! آپ میرے سر کا تاج ہیں اور میں آپ کے جوتے کی خاک بھی نہیں۔ آپ کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ میں عمر بھر ان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ فقیر کے پاس دعا کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ کا اقبال اور زیادہ بڑھائے۔"

پٹواری شمس الدین ایک جہاں دیدہ اور خرانٹ آدمی تھا۔ مہندی میں رنگی سیاہی مائل سرخ چگی داڑھی جو اس کے چہرے پر خوب پھبتی تھی۔ تیز عقابی نگاہیں جو دل کی گہرائیوں تک کا کھوج لگا آئیں اس نے استاد فلک کی باتوں کا ذرا اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو بھی استاد! کیا باتیں کرتے ہو۔ کس کا احسان اور کیسا احسان! میں نے جو کچھ کیا ہے۔ اپنا فرض سمجھ کے کیا ہے اور جو کچھ کروں گا اپنا فرض سمجھ کے کروں گا۔ ہم دیہاتی لوگ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ ہمیں شہر والوں کی سی بناوٹ کی باتیں اور دنیاداری نہیں آتی اور نہ ہم ایک دوسرے سے شہر والوں کی سی بیگانگی برت سکتے ہیں۔ ہمارے لئے ایک کی اولاد سارے قصبے کی اولاد ہوتی ہے۔"

گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ تکیہ سائیں اپنی کالی کملی سنبھالتا ہوا آ گیا اور جلدی سے کہنے لگا:

"اگلی جمعرات مشاعرے کے لئے کیسی رہے گی؟"

"ٹھیک رہے گی۔ کیوں استاد فلک؟"

"ویسے تو ٹھیک ہے۔" استاد فلک نے کہا۔ "لیکن میں شاید اتنے دن یہاں نہ ٹھہر سکوں۔"

"وہ کیوں؟" پٹواری نے مصنوعی تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا:

"بات یہ ہے کہ اب کے میں ایک ضروری کام سے یہاں آیا ہوں۔ اور میں اکیلا بھی نہیں ہوں اور

شاید دو ایک دن میں واپس لاہور چلا جاؤں۔"

"خیر تو ہے؟ آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" پٹواری نے پوچھا۔

"میں ابھی تنہائی میں آپ سے عرض کروں گا۔"

"لیکن استاد فلک! نگینہ سائیں نے کہا: "مشاعرے کے بغیر تو ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ چاہے مشاعرہ کل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ تم بڑے شاعر سہی لیکن وطن کا بھی تم تو پر کچھ حق ہے۔"

"سائیں بادشاہو! میں خادم ہوں آپ کا۔ شاعر واعر نہیں ہوں۔ بھلا فقیر کو شاعری سے کیا واسطہ۔ باقی رہی یہ بات کہ لوگ مجھ کو اچھا کہتے ہیں تو یہ کرم ہے میرے مولا کا۔ ورنہ میری کیا ہستی ہے!"

اچانک پٹواری نے استاد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تو آؤ استاد! اس گوشے میں پیڑوں کے نیچے بیٹھ کے بات کرلیں۔ مجھے ایک ضروری کام سے گھر پر جلدی جانا ہے۔"

یہ کہہ کر پٹواری استاد کا ہاتھ پکڑ اسے اس گوشے کی طرف لے گیا، جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں اِکا دُکا ہی آدمی تھے۔ جوان کے آنے پر وہاں سے چلے گئے۔ دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد استاد نے کہنا شروع کیا۔

"پٹواری جی! جب سے میری گھر والی فوت ہوئی ہے میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ اگر مہتاب بی بی کا خیال نہ ہوتا تو میں نے کبھی کی فقیری اختیار کر لی ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے مہتاب کی نگہداشت اپنی بیٹیوں کی طرح کی ہے۔ دراصل آپ ہی اِس کے باپ ہیں۔ مجھ میں اتنی توفیق ہی کب تھی کہ اسے پالتا پوستا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا اور میں جب تک جیتا رہوں گا، میرا رُواں رُواں آپ کو دعائیں دیتا رہے گا۔"

"آگے کہو استاد!" پٹواری نے اس لمبی تمہید سے اکتاتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے پٹواری جی! مہتاب بی بی اب ماشاءاللہ جوان ہوگئی ہے۔ مجھے کئی دنوں سے فکر تھی کہ وہ جلد سے جلد کسی شریف کے گھر ٹھکانے سے بیٹھ جائے۔ تاکہ میں اس فریضے سے سبکدوش ہو کے حج کو چلا جاؤں اور زندگی کے باقی دن سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضۂ اقدس کی جاروب کشی میں گزار دوں۔"

"سبحان اللہ! اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" پٹواری نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پروردگار کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اس نے میری تمنا جلد ہی پوری کر دی اور مجھے لاہور ہی میں ایک بہت اچھا رشتہ مل گیا ہے۔ یہ بی بی جو میرے ساتھ آئی ہے، لڑکی کو دیکھنے ہی کے لئے آئی ہے۔"

"وہ جو ٹھیکیدار کی بیوہ ہے؟"

"جی ہاں!"

"اور جس کو تم نے سرائے میں ٹھہرایا ہے۔"

"جی ہاں!"

"لڑکے کی کوئی رشتہ دار ہے؟"

''اس کی بڑی بہن ہے۔''

''لڑکے کی عمر کیا ہے؟''

''یہی کوئی بیس پچیس برس۔ بڑا شریف لڑکا ہے۔ صورت شکل کا بھی اچھا ہے۔''

پٹواری کچھ دیر خاموشی سے اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ ابھی تک اس نے اپنی کسی حرکت سے یا چہرے کی کیفیت سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اس خبر کا اس پر کیا اثر ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ استاد کو امید و بیم کی حالت میں رکھ کر وہ دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا ہے۔ جب استاد کی بے چینی حد سے بڑھ گئی تو اس نے مہرِ خاموشی کو توڑا اور دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''دیکھو استاد فلک! مہتاب بی بی ہے تو تمہاری بیٹی۔ لیکن اس کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے میں بھی اس پر کچھ حق رکھتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے اس کی پرورش کسی لالچ سے نہیں کی بلکہ محض انسانی ہمدردی کے خیال سے کی ہے اور سارا قصبہ گواہی دے گا کہ میں نے اسے اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھا ہے کیا اس کے صلے میں مجھے اتنا حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس کے مستقبل کے بارے میں مجھ سے بھی مشورہ کر لیا جاتا۔ مجھے اس بات سے دلی رنج ہوا ہے کہ تم نے بالا ہی بالا اس کے رشتے کی بات طے کر لی۔ آخر تمہیں اتنا خیال تو کر لینا چاہیے کہ جن لوگوں نے اسے پالا پوسا ہے انہیں اس سے کچھ نہ کچھ الفت تو ہو گی ہی۔ اور قدرتی طور پر وہ یہ چاہیں گے کہ وہ ایسی جگہ بیاہی جائے جہاں وہ آرام سے رہے اور خوش خوش اپنی زندگی کے دن گزارے۔''

''یہ تو سچ ہے پٹواری جی! لیکن یہ رشتہ......''

''سنو سنو! میری بات نہ کاٹو۔ یہ رشتہ جو مہتاب بی بی کے لئے لائے ہو۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سراسر نامناسب ہے۔ اول تو گاؤں کی لڑکی کا شہر کے لڑکے سے نباہ مشکل سے ہوتا ہے۔ پھر تم تو فقیری اختیار کر کے مکے مدینے چلے جاؤ گے۔ تمہارے پیچھے یہ بات کون دیکھے گا کہ لڑکی پر سسرال میں کیا بیت رہی ہے۔ اس پر کوئی ظلم تو نہیں ڈھایا جا رہا۔ سسرال قصبے میں ہو تو اس پر دباؤ بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ مگر شہر میں روز روز کون جایا کرے گا۔''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میں نے عرض کیا نا کہ خاندان بہت شریف ہے۔ لاہور کے مشہور ٹھیکہ دار ہیں۔''

''اس کو چھوڑو۔ اب تم لڑکے کی عمر ہی بیس پچیس برس بتلاتے ہو اور یہ تمہارا بیان ہے۔ ممکن ہے وہ تیس چالیس کا یا اس سے بھی زیادہ کا ہو۔ اور مہتاب بی بی تو زیادہ سے زیادہ ساڑھے چودہ برس کی ہو گی۔ پھر کیوں اتنی بڑی عمر والے لڑکے سے اس کا رشتہ کیا جائے۔ لڑکی بدصورت نہیں لنگڑی لولی نہیں۔ اندھی کانی نہیں۔ ماشاء اللہ سو پچاس میں ایک ہے۔ اسی قصبے کے بیسیوں نوجوان اس کے خواستگار ہوں گے پھر خواہ مخواہ کیوں شہر میں اس کی مٹی پلید کرائی جائے۔ مجھے حیرانی ہے کہ تمہیں ابھی سے اس کی فکر کیوں پڑ گئی۔ کیا لڑکی کی عمر بڑھتی جا رہی ہے یا ہم اس کی طرف سے بے پرواہ ہو گئے ہیں۔''

''بات یہ ہے پٹواری جی! میں نے سوچا اب بھی بیاہنا ہے جب بھی۔ رشتہ اچھا ملتا ہو تو اس موقع سے

کیوں فائدہ نہ اٹھایا جائے۔"

"سنو استاد فلک! تم ٹھہرے اللہ والے آدمی۔ تم کو دنیاوی دھندوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ جنہوں نے اسے چھوٹی سے بڑی کیا ہے، وہی اس کی شادی بیاہ کا انتظام بھی کر لیں گے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر پٹواری صاحب! اب تو میں زبان دے چکا ہوں۔ یہ رشتہ تو کرنا ہی ہوگا۔"

اس پر پٹواری نے درشتی سے کہا۔

"دیکھو خدا بخش! لڑکی کی بھلائی اور تمہاری عقل مندی اسی میں ہے کہ تم اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔ اور ان بی صاحبہ کو یہاں سے لے کر چل دو۔ لیکن اگر تمہیں اس رشتے سے کسی اور قسم کا فائدہ اٹھانا مقصود ہے اور تم اس پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ میں اس معاملے کو پنچوں کے سامنے لائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔"

پٹواری شمس الدین کی مدلل تقریروں اور اس آخری تہدید آمیز گفتگو نے استاد فلک کے جذب و کشف کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور اسے عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔ جہاں اس وقت وہ ایک ادنیٰ سا کم فہم انسان معلوم ہو رہا تھا۔

اس وقت شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ تکیے میں مٹی کے چراغ روشن کئے جا رہے تھے۔ سب لوگ ابھی تک تکیے ہی میں موجود تھے اور بے تابی سے اس امر کے منتظر تھے کہ دیکھیں استاد خدا بخش فلک اور پٹواری شمس الدین کی بات چیت کیا رنگ لاتی ہے۔

جس وقت استاد فلک اور پٹواری تکیے کے ایک الگ تھلگ گوشے میں مصروف گفتگو تھے، مہتاب بی بی محلے کی لڑکیوں کے ساتھ تکیے کے کنوئیں پر پانی بھرنے آ گئی تھی۔ یہ محلہ جس میں پٹواری کا گھر تھا تکیے سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ گھروں میں پانی بھرنے کا کام جو عموماً کنواری لڑکیوں کے سپرد ہوتا تھا، شام پر اٹھا رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ شام کی نیم تاریکی انہیں گھونگھٹ سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی شخص کنوئیں کا تازہ اور ٹھنڈا پانی پینے آ جاتا تو وہ دیہاتی رواداری کی بنا پر ان لڑکیوں کے دو چار گھڑے بھروا جاتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی چنچل لڑکی کسی لڑکے کو آس پاس کھڑے دیکھتی تو شوخی اور بھولے پن کے ملے جلے انداز میں خود ہی اس سے درخواست کرتی کہ بھیا ذرا کنوئیں سے دو ایک ڈول نکال کے میرا گھڑا تو بھروا دو۔

شام کی تاریکی نے مہتاب بی بی کے میلے کپڑوں اور پھٹی ہوئی اوڑھنی کے عیبوں پر تو پردہ ڈال دیا تھا مگر وہ اس کی دراز قامتی، اس کی اٹھتی جوانی اور گوری گوری صورت کو نہیں چھپا سکی تھی جو جھٹپٹے میں شام کے ستارے کی طرح تابندہ تھی۔ وہ کنوئیں کے پاس زمین پر اپنے گھڑے کو پکڑے بیٹھی تھی اور مولو کنوئیں سے ڈول نکال نکال کے گھڑے میں پانی ڈالتا جاتا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو تین لڑکیوں کے گھڑے بھر چکا تھا۔

کنوئیں سے پانی نکالنے سے پہلے اس نے اپنے گاڑھے کا کرتہ اتار کے سقاوے کی دیوار پر رکھ دیا تھا اور تہمد کو لنگوٹ کی طرح کس کے باندھ لیا تھا۔ اس کا سڈول جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اور پے در پے ڈول نکالتے رہنے سے اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئی تھیں۔

"مہتاب!" اس نے کہا۔ "تمہیں خبر ہے تمہارا ابا آیا ہے۔"

''ہاں میں نے سنا ہے۔''

''تم سے ملا نہیں؟''

''نہیں ابھی نہیں۔''

''اس وقت تو چچا اور پٹواری میں بڑی رازداری کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

''کہاں؟''

''وہ اُدھر، ان درختوں کی اوٹ میں، نگینہ سائیں کی جھونپڑی کے پاس۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''یہ تو معلوم نہیں۔ لیکن سنا ہے.....''

''کیا سنا ہے؟''

''کچھ تمہارا ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔''

''میرا معاملہ؟'' مہتاب بی بی نے حیرانی سے مولو کی طرف دیکھا۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ ''چلو۔ مجھے جھوٹ موٹ بہکاؤ نہیں۔''

''نہیں، سچ کہتا ہوں۔ ایک عورت بھی آئی ہے چچا کے ساتھ۔''

''ہاں یہ بھی سنا ہے۔''

''ہوسکتا ہے تمہارے بیاہ کی بات چیت ہو رہی ہو۔''

مولو نے ذرا شوخی سے کہا۔

''مولو بھیا!'' مہتاب نے تنک کر کہا۔ ''کنواری لڑکیوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔''

''واہ! اس میں شرم کی کیا بات ہے۔'' مولو نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم شہری لڑکے کے پلے پڑتی ہو یا دیہاتی کے۔''

جس وقت وہ یہ کہہ رہا تھا، ایک لڑکی جو ابھی ابھی گھڑا بھروا کے لے گئی تھی، خالی گھڑا لئے آتی دکھائی دی۔ مہتاب نے جلدی سے کہا:

''مولو! تم بہت خراب ہو۔ اب میں تم سے گھڑا نہیں بھرواؤں گی۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا گھڑا جو کبھی کا بھرا جا چکا تھا، اٹھا کے کولھے پر رکھ لیا اور بغیر کچھ کہے یا مولو کی طرف دیکھے وہاں سے چل دی۔ ادھر مولو بھی دوسری لڑکی سے یہ کہتا ہوا کہ ''بس میں تھک گیا ہوں۔ اب کسی اور جوان کو پکڑو۔'' دیوار سے اپنا کرتہ اٹھا، گلے میں ڈال وہاں سے کھسک گیا۔

تکیے کے دروازے پر مولو کی مڈبھیڑ سلطان سے ہوئی جو اسی کی راہ دیکھ رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قریب کے اس کھلے میدان کی طرف چل دیئے جس میں ہری ہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر سلطان نے کہا۔

''استاد فلک اور پٹواری میں ابھی ابھی جھگڑا ہو چلا تھا۔ دونوں زور زور سے بول رہے تھے۔ استاد فلک کے منہ سے مارے غصے کے کف نکل رہا تھا اور پٹواری اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ تو کہو اگر نگینہ سائیں بیچ

میں نہ آ پڑتے تو ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی۔"

"آخر یہ سارا قصہ ہے کیا؟" مولو نے پوچھا۔

"اصل حال تو ابھی کسی کو معلوم نہیں لیکن پٹواری کہتا ہے کہ استاد نے اس کو اس عورت کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے جو اس کے ساتھ آئی ہے۔ شادی کی بات بالکل جھوٹ ہے اور یہ عورت کسی ٹھیکہ دار کی بیوی نہیں بلکہ کوئی مشکوک چال چلن کی عورت ہے اور عجب نہیں کہ بردہ فروش ہو جو مہتاب کے حسن و جمال کی وجہ سے اسے کسی مالدار کے ہاتھ بہت زیادہ منافع پر بیچنا چاہتی ہو۔

"ہائے کیسا زمانہ ہے!" مولو نے اداسی کے لہجہ میں کہا۔

"مجھے تو رہ رہ کے بیچاری مہتاب کا خیال آتا ہے۔ جب اس کے کانوں تک یہ باتیں پہنچیں گی تو وہ اپنے دل میں کیا خیال کرے گی۔ وہ کیسے اشتیاق کے ساتھ باپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔ مگر اب اس جھگڑے کے بعد پٹواری، چچا کو اپنے گھر میں تو گھسنے نہیں دے گا۔"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا۔ پٹواری اپنے لنگڑے بھتیجے سے مہتاب کی شادی کر دے گا جس کا اس نے ایک عرصے سے منصوبہ باندھ رکھا ہے۔"

"لیکن مہتاب تو اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔"

"نہ ہو۔ لیکن ہوگا وہی جو پٹواری چاہے گا۔ قصبے میں کس کی مجال ہے جو پٹواری کے آگے بول سکے۔"

"لیکن بابو اگر اس کا فیصلہ پنچوں سے کرایا جائے تو؟"

"تو بھی کیا ہوگا۔ پٹواری کہے گا۔ اچھا صاحب باپ کے مقابلے میں بیٹی پر میرا کوئی حق نہ سہی۔ لیکن میں نے دس برس تک اس کی تربیت پر جو روپیہ خرچ کیا ہے وہ تو مجھے دلوایا جائے۔ استاد کا وعدہ تھا کہ وہ ہر مہینے لڑکی کا خرچہ شہر سے بھیجتا رہے گا۔ اس نے یہ وعدہ کب پورا کیا۔ اب اگر پنچ مہتاب کے کھانے پینے، کپڑے لتے کا خرچ پندرہ روپے ماہوار بھی مقرر کریں جب بھی تقریباً دو ہزار روپے بنتے ہیں۔ بھلا استاد اتنے روپے کہاں سے لائے گا۔"

"اور استاد نے اس عورت سے جو رقم وصول کی ہے؟"

"جھوٹ ہو۔"

"لیکن بابو! یہ تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ کچھ دال میں کالا ہے ضرور۔"

"وہ تو ہے ہی۔"

اب وہ دونوں قصبے کی چراگاہ میں پہنچ گئے تھے۔ جہاں اس وقت کچھ گائیں بھینسیں چر رہی تھیں۔ اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ آسمان پر چھٹی یا ساتویں کا چاند نکل آیا تھا۔ اس کی ہلکی روشنی میں وہ گھاس کا ایک صاف سا ٹکڑا دیکھ کر اس پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ اس میدان میں اکثر زور آزمائی کیا کرتے، دوڑ لگاتے یا ایک

دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے مگر آج ان کی طبیعت اِدھر نہیں آتی تھی۔ مہتاب بی بی کے مستقبل کے خیال سے دونوں بڑے اداس ہو گئے تھے۔

گھاس کی نرماہٹ اور گدگدے پن نے جلد ہی انہیں لیٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ دونوں کچھ دیر اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے لیٹے لیٹے خاموشی سے گھاس کے تنکے توڑ توڑ کر دانتوں میں چباتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوا چانک اٹھ کر بیٹھ گیا اور سلطان کے قریب سرک آیا۔ پھر وہ بڑے سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا:

''بابو! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو۔''

''سچ سچ بتاؤ گے؟''

''میں نے آج تک تم سے کوئی بات چھپائی ہے؟''

''مہتاب بی بی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کیا مطلب؟'' یہ کہتے کہتے سلطان بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔

''کیا تم سچ مچ اسے خوبصورت سمجھتے ہو؟''

''ہاں اچھی شکل کی ہے۔''

''چال چلن بھی ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہی ہوگا۔ آج تک اس کے خلاف کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔''

''دسگھڑ بھی ہے؟''

''ضرور ہوگی۔ کیونکہ پٹواری کے گھر کا سارا بار اسی کے کندھے پر ہے۔''

''تم ان باتوں کو مانتے ہو؟''

''ہاں کیوں نہیں۔''

''تو پھر تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

جس وقت مولو نے یہ کہا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور اس کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں سخت ہلچل مچی ہوئی ہے۔

اس غیر متوقع سوال نے اچانک سلطان کو گم سُم بنا دیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ نے یاوری نہ کی اور وہ مضطرب سا ہو کر پھر گھاس پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ اس کے بعد مولو اس کے اور قریب سرک آیا اور ایک ایسے لہجے میں جس میں اب کچھ کچھ خود اعتمادی پیدا ہو چلی تھی۔ کہنا شروع کیا:

''بابو! میں جانتا ہوں کہ تم امیر خاندان کے ہو اور تمہارا چچا اپنے جیسے کسی اونچے زمیندار گھرانے ہی میں تمہاری شادی کرنا چاہے گا۔ مگر تم چاہو تو اس کو مجبور کر کے اس شادی پر راضی کر سکتے ہو۔ مہتاب اس وقت سخت مصیبت میں ہے۔ اس کے باپ اور پٹواری دونوں کو اس سے ذرا بھی لگاؤ یا ہمدردی نہیں۔ دونوں اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ لیکن تم چاہو تو اس کو دونوں کے چنگل سے نکال سکتے ہو۔ تمہارے

ماں باپ زندہ نہیں۔ فقط چچا کی ایک ذات ہے۔ وہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔ مہتاب بہت نیک لڑکی ہے۔ وہ عمر بھر تمہاری تابعدار بن کے رہے گی۔"

سلطان لیٹا ہوا غور سے مولو کی باتیں سن رہا تھا۔ اس آخری فقرے نے اچانک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر دی اور اس نے ذرا شگفتہ مزاجی سے کہا:

"تم خود اس کو اپنا تابعدار کیوں نہیں بنا لیتے۔ آخر تم بھی تو اس کی محبت کا دم بھرتے ہو۔"

مولو نے لحہ بھر تامل کیا۔ پھر اپنی سنجیدگی کو قائم رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک میں مہتاب کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ میں ایک غریب کسان کا بیٹا ہوں۔ ہمارے پاس نہ زر ہے نہ زمین۔ میں اور میرا باپ دونوں دوسروں کی زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ ہمارا اس قسم کا خیال کرنا بھی جگ ہنسائی ہوگا۔"

"لیکن یار مولو!" سلطان کی خوش طبعی اب زور کر رہی تھی۔

"سچ سچ بتا اگر میں مہتاب سے شادی کر لوں تو تجھے دکھ نہیں پہنچے گا کہ تیرا سب سے پیارا دوست تیرا ہی رقیب بن گیا!"

"ہاں تھوڑا سا دکھ پہنچے گا مگر یہ سوچ کر کہ مہتاب سب مصیبتوں سے چھوٹ گئی ہے، اس کی زندگی بڑے سکھ اور آرام سے گزر رہی ہے، شاید بعد میں بہت زیادہ خوشی ہو۔"

گو سلطان نے یہ بات مذاق ہی مذاق میں کہی تھی مگر مولو نے پوری سنجیدگی سے اس کا جواب دیا تھا۔ جس سے سلطان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ سلطان کی نظریں تکیے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسے دور سے نگینہ سائیں کی کوٹھڑی کا دیا ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ادھر مولو اس سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا تھا۔ اس نے اس کے جواب کے لیے سلطان سے اصرار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ کچھ بے نیاز سا ہو کر اس کے قریب ہی گھاس پر لیٹ گیا اور گھاس کا ایک نیا تنکا توڑ کر چبانے لگا۔

اس وقت آس پاس کی فضا بڑی پرسکون تھی۔ دن بھر کی سخت دھوپ اور گرمی کے بعد اب ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا جسے صرف گائے بھینسوں کی چرنے کی آواز توڑ رہی تھی۔ یا پھر کبھی کبھی تکیے میں سے کسی مست کا بلند آہنگ نعرہ سنائی دے جاتا۔

"صابر۔ دلا دے چون کروڑ کی تہائی!"

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں، گھاس کی نرماہٹ اور کھلی فضا نے جلدی ہی دونوں پر نیند کی کیفیت طاری کر دی اور وہ خاصی دیر تک وہیں گھاس پر بے حس و حرکت پڑے رہے۔ آخر سلطان نے کروٹ لی اور سر اٹھا کے مولو کی طرف دیکھا۔

"مولو۔ مولو۔" اس نے کہا۔ "اٹھو دیر ہو گئی۔ چلو گھر چلیں۔"

ذرا سی دیر میں مولو بھی انگڑائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور پھر وہ دونوں کپڑوں سے گھاس پھونس جھاڑ تکیے کی طرف چل دیے۔ جس وقت تکیہ چند قدم پر رہ گیا تو سلطان نے مولو سے کہا:

''جو بات تم نے پوچھی ہے۔ اس کا جواب میں تمہیں دو تین روز میں دوں گا۔''
مولو کو اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر جو راستے میں پڑتا تھا، سلطان اپنے گھر کی طرف چلا جو کوئی دو سو قدم اور آگے تھا۔ مگر وہ اپنے گھر میں داخل نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے محلے سے باہر نکل آیا۔ یہاں کچھ علاقہ ویران سا تھا جس کے بعد پھر آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ قصبے کی سرائے اسی حصے میں تھی اور وہاں بھی ویسی ہی ایک چراگاہ تھی۔ جیسی گوندنی والے تکیے کے پاس تھی۔ سلطان کے قدم اسے اسی سمت لے چلے۔

وہ یوں بھی رات کو دیر ہی سے گھر آیا کرتا تھا۔ پھر جب سے اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے اور بھی دیر دیر تک باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ چچا اس خیال سے زیادہ باز پرس نہ کرتا کہ ابھی اس کی یتیمی کا صدمہ تازہ ہے۔ البتہ چچی اس کی طرف سے فکر مند ہو کر اکثر کہا کرتی کہ کھانا وقت پر آ کر ضرور کھا لیا کرو۔ پھر جہاں جی چاہے، گھومتے رہا کرو۔

چنانچہ سلطان صبح کو ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا۔ اور دوپہر کو ٹھیک کھانا کھانے کے وقت آ جاتا۔ مگر رات کے کھانے کے متعلق اس نے چچی سے کہہ رکھا تھا کہ آپ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ بس میرے حصے کا کھانا چھینکے میں لٹکا کر رکھ دیا کریں۔ میں آپ ہی آ کے کھا لیا کروں گا۔ چچی کو یہ منظور نہ تھا۔ مگر اس کے شوہر نے سمجھایا کہ لڑکے کو باپ کے مرنے کا سخت صدمہ پہنچا ہے۔ گھر میں اس کا جی نہیں لگتا۔ وہ جو چاہتا ہے اسے کرنے دو۔ تھوڑے دنوں میں وہ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اور یوں سلطان کو گھر کی پابندیوں سے آزادی مل گئی تھی۔

سلطان کا چچا چودھری رحمت علی ایک سیدھا سادہ نیک دل انسان تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی یعنی سلطان کے والد مرحوم چودھری حشمت علی کا حد سے زیادہ ادب کیا کرتا تھا۔ ان کی زندگی میں اسے ان کے سامنے کبھی زبان کھولنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ اسے سلطان سے بھی دلی انس تھا۔ چنانچہ وہ اس کی دلداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ اس کے اپنے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ مگر وہ تینوں عمر میں سلطان سے چھوٹے تھے۔ اور باپ کے ڈر سے ان کی مجال نہ تھی کہ وہ سلطان کے سامنے چوں بھی کر سکیں۔ سلطان کو باپ جو جیب خرچ دیا کرتا تھا، چچا نے اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ جسے سلطان نے بادل ناخواستہ منظور کر لیا تھا۔ غرض سلطان کو گھر یا باہر کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل قصبے کی زندگی سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی عمر یہاں یونہی ضائع ہوتی جا رہی ہے۔

جب اس نے قصبے کے مڈل اسکول سے آخری امتحان پاس کر لیا تھا تو باوجود اس کے اصرار کے باپ نے اسے میٹرک کے لیے شہر نہیں بھجوایا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے چودھری حشمت علی مرحوم کا یہ قول بھی تھا کہ ایک زمیندار کے بیٹے کے لیے بس اتنی ہی تعلیم کافی ہے کہ وہ اپنی زمینوں کا حساب کتاب رکھ سکے۔ اعلیٰ تعلیم نوکری کی ترغیب دلاتی ہے جو زمینداروں کے لیے باعث ننگ ہے۔ انہیں سلطان سے اس قدر الفت تھی کہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی کہ کہیں سوتیلی ماں اسے دکھ نہ پہنچائے۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد سلطان کا وقت زیادہ تر گوندنی والے تکیے میں کٹنے لگا۔ جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہتا۔ بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں، راگ رنگ، کھیل، تماشے، لطیفے بازی، قوالی۔ کبھی کبھی پنجابی کا مشاعرہ بھی ہوتا۔ جس کا انتظام استاد فلک کے سپرد ہوتا۔ جب گوندنی کا موسم آتا اور قصبے کے لڑکے گوندنی توڑنے کے لیے پیڑوں پر چڑھ جاتے تو ان کے ساتھ سلطان بھی کسی پیڑ پر چڑھ جاتا، مگر گوندنی توڑنے کے لیے نہیں بلکہ قصے کہانی کی کوئی کتاب یا ناول پڑھنے کے لیے۔ وہ پیڑ کی کسی بڑی سی، آرام دہ ڈال پر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں مطالعہ میں مصروف رہتا۔

یہ ناول عموماً عشقیہ یا سراغ رسانی کے ہوتے جن کے پڑھنے میں وہ ایسا محو ہو جاتا کہ اسے نہ بھوک کی پرواہ ہوتی نہ پیاس کی۔ اور لڑکے تو گوندنی توڑ توڑ کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے مگر وہ گھنٹوں درخت ہی پر بیٹھا رہتا۔ اسے سفرنامے پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ دراصل ان سفرناموں ہی کو پڑھ پڑھ کر اس کے دل میں دنیا کی سیر و سیاحت کی دھن سما گئی تھی۔

قصبے کے لڑکوں میں مولو کے سوا سلطان کی کسی اور سے بے تکلف دوستی نہ تھی۔ مگر مولو اس کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ اسے روزی کمانے کے لیے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ البتہ جیسے ہی اسے کام سے چھٹی ملتی وہ سیدھا سلطان کے پاس پہنچتا اور پھر وہ دونوں شام تک اکٹھے ہی رہتے۔

سلطان اب چلتے چلتے قصبے کے اس علاقے میں پہنچ گیا تھا جہاں قصبے کی واحد سرائے تھی۔ اس وقت تقریباً دس بجے تھے اور ابھی بہت رات باقی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی چچی کو اطلاع کیے بغیر ایک گھنٹہ بخوبی یہاں گزار سکتا تھا۔ اسے اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی تاکہ وہ اس مسئلے پر غور کر سکے جو اس مولو نے اچانک پیدا کر دیا تھا۔

اب وہ اس علاقے کی چراگاہ میں جہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا اور کوئی نفس چلتا پھرتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ایک صاف سی جگہ دیکھ کے گھاس پر لیٹ گیا۔ سامنے فاصلے پر محلے کے چھوٹے چھوٹے مکان تھے جو اپنے سایوں کی وجہ سے بڑے بڑے نظر آ رہے تھے۔ ان میں اس وقت اندھیرا تھا اور بظاہر زندگی کے آثار مفقود تھے۔ البتہ سرائے کے بڑے سے پھاٹک کے باہر کھمبے سے بندھی ہوئی ایک لالٹین میں سے مدھم مدھم روشنی نکل رہی تھی۔

سلطان نے سوچنا شروع کیا۔ استاد خدا بخش فلک اور وہ عورت جسے اس نے ٹھیکہ دار کی بیوہ بتایا ہے اسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ نہ جانے اس وقت وہ کیا کر رہے ہوں گے۔ ان میں آپس میں کیا معاملہ ہے؟ وہ عورت دراصل کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ اس کے سراغ رسانی کے ناولوں کے شیدائی دماغ میں یہ سوال بار بار اٹھنے لگے مگر ان کا کوئی جواب اسے نہ سوجھتا تھا۔

اب اس نے مہتاب بی بی کے معاملے پر غور کرنا شروع کیا۔ کیا اس کی زندگی واقعی خطرے میں ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ اس کے دل کے کسی گوشے میں استاد فلک کی بیٹی نے اپنی جگہ بنا رکھی ہے؟ کیا اس کی کسی حرکت سے مولو پر یہ بات ظاہر ہو گئی ہے ایسا ضرور ہوا ہوگا۔ ورنہ مولو اس سے شادی کر لینے کی تجویز کیوں

پیش کرتا۔

مہتاب سے مولو کی ملاقات تو اکثر تکیے کے کنوئیں پر ہوتی رہتی تھی اور کبھی کبھی معصومانہ چھیڑ چھاڑ بھی۔ جس کا حال وہ مزے لے لے کر سلطان کو سنایا کرتا تھا۔ مگر سلطان کی مہتاب سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ دور ہی دور سے دونوں کی آنکھیں کئی بار ضرور لڑ چکی تھیں۔ اور مہتاب کی جلدی سے جھک جانے والی نظریں، اور تمتما اٹھنے والے رخسار سلطان کے دل میں ایک خوش آئند بے چینی پیدا کر دیتے تھے۔

جب کبھی تکیے میں کوئی تقریب یا کوئی غیر معمولی ہنگامہ ہوتا، بھانڈوں کی کوئی نئی ٹولی اپنا کمال دکھانے کے لیے کسی دوسرے قصبے سے آتی یا حال وقال کی کوئی نئی محفل جمتی، قوالی ہوتی اور گاؤں کا کوئی من چلا، سرمستی و بے خودی میں رسے سے اپنے دونوں پیر بندھوا کر پیڑ سے الٹا لٹک جاتا اور قوالوں کی ڈھولک کی تال کے ساتھ ساتھ جھونٹے لینے لگتا۔ منہ اور نتھوں سے زور زور سے پھنکارتا تو یہ تماشہ دیکھنے کے لیے آس پاس کے گھروں سے عورتیں بھی تکیے میں آ جمع ہوتیں۔ ایسے میں نہ جانے کس طرح مہتاب کی نظریں سلطان کو ڈھونڈ ہی لیتیں۔ خواہ وہ مجمع میں کہیں بھی کھڑا ہوتا۔

یہ بھی کچھ عجیب سی بات تھی کہ سلطان نے مولو کو اپنا رقیب کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ مولو کی زبان پر بار بار مہتاب کا نام آتا تھا اور پھر ہر روز اس کا تکیے کے کنوئیں پر مہتاب کے انتظار میں رہنا، اور اس کے طفیل گاؤں بھر کی لڑکیوں کے گھڑے بھر دینا بھی سلطان سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ مولو مہتاب کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ اس کے خوش آئندہ مستقبل کے لئے اپنی محبت کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار تھا جو اس کی سچی محبت کا ثبوت تھی۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اگر سلطان چاہے تو مہتاب بی بی کی زندگی کو خوشیوں سے بھر سکتا ہے۔ اپنے مہربان اور شفیق چچا کو اس رشتے پر آمادہ کر لینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ قصبے بھر میں اس کا چچا ہی وہ واحد شخص ہے جو پٹواری کے دبدبے کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے تو کیا وہ گاؤں کی ایک لڑکی کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنی آزادی، اپنی سیر و سیاحت کے ارمانوں کا خون کر دے! وہ ارمان جنہیں اس نے اپنے والد کی زندگی میں اپنے سینے ہی میں دبائے رکھا تھا۔ اب جب کہ قدرت نے اسے ان ارمانوں کے پورا کرنے کا موقع دیا ہے، وہ اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوالے۔

سلطان کے خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ اسے سرائے کے پھاٹک کے باہر کچھ سائے سے ہلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ سائے قریب آ گئے۔ اور ساتھ ہی ان کی باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ اچانک سلطان کو اپنے ناولوں کے سراغرسانوں کی یاد آئی۔ اس نے سوچا۔ مجھے ان لوگوں سے خود کو پوشیدہ رکھنا چاہیے۔ اس نے جلدی سے آس پاس نظر دوڑائی۔ اسے اپنے قریب ہی میدان میں ایک نشیب نظر آیا۔ اور وہ بڑی پھرتی سے لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتا ہوا اس نشیب میں پہنچ گیا۔

ادھر اب وہ سائے میدان میں آ پہنچے تھے۔ جیسا کہ سلطان کا قیاس تھا یہ استاد فلک اور وہ کٹھنی برقعے والی عورت ہی تھی۔ جسے ٹھکیدارنی بتایا گیا تھا۔ اس وقت اس نے برقع اتار کر بغل میں دبا رکھا تھا اور سر پر صرف دوپٹہ تھا۔

سلطان ان کی نظروں سے اوجھل ان سے اتنا قریب تھا کہ ان کی باتیں صاف سن سکتا تھا۔ عورت کہہ رہی تھی۔

"شکر ہے کہ یہاں تو خوب ٹھنڈک ہے۔ سرائے میں تو کمبخت مچھروں نے کاٹ کاٹ کے جسم چھلنی کر دیا۔"

"ٹھیک ہے۔" استاد فلک نے جواب دیا۔ "یہیں گھاس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے میں جب ذرا اور خنکی ہو جائے گی تو سرائے میں چلے چلیں گے۔"

"میں تو اب وہاں جانے کی نہیں۔ آس پاس کوئی ہے نہیں۔ میں تو برقع بچھا کے یہیں لیٹ جاتی ہوں۔"

اور وہ سچ مچ گھاس پر برقع بچھا کے لیٹ گئی۔

استاد اس کے قریب ہی گھاس پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر استاد نے لجاجت سے کہا "میں بھی تمہارے قریب ہی لیٹ جاؤں خورشید جی۔"

"ہاں۔ مگر پرے ہٹ کے۔ اور خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ تمہیں میری شرط یاد ہے نا!"

"بڑی ظالم ہو خورشید!"

یہ کہہ کے استاد نے ٹھنڈا سانس لیا۔ پھر اس سے ذرا ہٹ کے گھاس پر لیٹ گیا۔

"خدا بخش! تم مہتاب کو کب دکھلاؤ گے؟"

"ابھی ذرا اور صبر کرو خورشید۔ مہتاب کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ وہ میری بیٹی ہے۔ اور جب تم مجھے اپنی غلامی میں لوگی تو تم شرعاً اس کی ماں ہو گی۔ تم کو اختیار ہو گا کہ جس طرح چاہو اسے رکھو۔ اور جس قسم کی تعلیم چاہو اسے دلواؤ۔"

خورشید نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔

"میں کل تمام گاؤں والوں کو اکٹھا کروں گا اور پٹواری کی چال بازیوں کا پول کھولوں گا۔ وہ چاہتا ہے کہ میری بیٹی کو اپنے لنگڑے اور نکھے بھتیجے سے بیاہ دے اور اس طرح اپنے بھائی کی زمینوں پر قابض ہو جائے۔ لیکن میرے مولا کا کرم ہوا تو میں اس کی ایک نہ چلنے دوں گا۔"

"اور اگر پٹواری نے روپیہ مانگا۔"

"کونسا روپیہ؟"

"وہ جو اس نے مہتاب کی پرورش پر خرچ کیا ہے۔"

"خاک خرچ کیا ہے۔ وہ مہتاب کو دو وقت کی روٹی تو دیتا رہا ہے۔ مگر اس کے بدلے اس سے نوکرانیوں سے بھی بدتر کام لیتا رہا ہے۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ پٹواری کی گھرداری کا سارا بوجھ مہتاب ہی کے کندھے پر ہے۔ وہ سارے گھر کے لیے کھانا پکاتی ہے۔ پانی کے گھڑے بھر کے لاتی ہے۔ پٹوارن کے ہاتھ پاؤں دابتی ہے اور اس کی بیٹیاں..... نواب زادیوں کی طرح سارا دن پڑی پڑی چارپائیاں توڑتی رہتی ہیں۔"

''یہ تو سچ ہے۔ مگر گاؤں میں پٹواری کا بڑا مان ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تمہارا ساتھ کون دے گا؟''

''فکر نہ کرو خورشید! میں نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے۔''

''وہ کیا خدا بخش؟''

استاد نے کسی قدر توقف کر کے کہا:

''میرے مولا نے چاہا تو میں جلد ہی گوندنی والے تکیے میں ایک بڑا بھاری مشاعرہ کراؤں گا۔''

اگلے روز صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ استاد فلک تکیے میں جا پہنچا اور حسب معمول نگینہ سائیں کو اپنی جھلنگی چارپائی پر آنکھیں بند کیے اکڑوں بیٹھے پایا۔ نگینہ سائیں کو کبھی کسی نے سوتے نہیں دیکھا۔ وہ رات بھر یا تو تکیے میں گھومتا رہتا یا پھر چارپائی پر گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اسی حالت میں بیٹھا رہتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مراقبے میں ہے یا سو رہا ہے۔ قصبے کے لوگ بہت سی مافوق الفطرت باتیں اس کی ذات سے منسوب کرتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو اسے مراقی یا سودائی سمجھتے تھے۔

سائیں کی کوٹھڑی کے آس پاس گوندنی کے پیڑوں کے نیچے چٹائیوں پر ابھی تک کئی لوگ بدن کے ستر سے بے پروا نیند میں مدہوش تھے ان میں کچھ تو سائیں کے چیلے چانٹے تھے اور کچھ وہ خانہ بدوش جن کے پاس رات گزارنے کے لیے کوئی اور جگہ نہ تھی۔ اس وقت تکیے میں بابا علیا کے سوا جو چولھے میں آگ جلانے کی فکر میں تھا، اور کوئی متنفس چل پھر نہیں رہا تھا۔

بابا علیا سے علیک سلیک کے بعد استاد فلک نگینہ سائیں کی چارپائی کے پاس پہنچا اور اونچی آواز میں کہنے لگا:

''سائیں بادشاہو! السلام علیکم!''

چند لمحوں تک سائیں کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھایا اور اپنی سرخ مخمور آنکھیں کھول کر استاد کی طرف دیکھا۔

''سائیں بادشاہو!'' استاد نے کہا۔ ''آپ کل مشاعرے کی بات کر رہے تھے نا، آپ جمعرات کو مشاعرہ کر لیجیے۔ سائیں بادشاہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہ عاجز مشاعرے تک یہیں رہے گا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے استاد فلک جی!'' سائیں نے جواب میں کہا۔

''لیکن سائیں جی اب کے مشاعرہ تو ایسا ہو کہ برسوں لوگوں کو یاد رہے۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ پانی کا بلبلہ ہے نہ جانے کب پھوٹ جائے۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ شہر کے نامی گرامی شاعروں کو اپنے گاؤں بلواؤں۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ ناچیز آج ہی سب کو خط لکھ دیتا ہے۔ ابھی چار دن باقی ہیں۔ میرے مولا نے چاہا تو سب وقت سے پہلے ہی یہاں پہنچ جائیں گے۔ یہ عاجز شہر میں خاصی عزت اور وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ کرم ہے مولا کا ورنہ میں کیا اور میری ہستی کیا۔ میرے مولا نے چاہا تو سب شاعر دوڑے آئیں گے۔''

عین اسی وقت بابا علیا نے چولھے کے پاس سے ہانک لگائی:

''پروا لے اُڑ گئے۔ بے پر کا خدا!''
استاد فلک نے اپنی بات جاری رکھی۔
''آس پاس کے گاؤں میں ہمارے جو دیہاتی بھائی ہیں۔ ان کے پاس میں خود جا کر اطلاع کر آؤں گا۔ رہے مقامی شاعر تو ان سے آپ خود کہہ دیجیے گا۔ سب کو تاکید کر دی جائے کہ بس قلم توڑ ڈالیں۔ شہر والوں سے مقابلہ ہے۔ قصبے کی عزت کا سوال ہے۔''
اس اثناء میں بابا علیا حقہ بھر لایا تھا۔ استاد فلک کے بعض بعض جملے اس کے کان میں بھی پڑ گئے تھے۔ مگر اصل بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس نے دونوں کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔
''علیا بابا! نگینہ سائیں نے کہا'' ہمارے استاد فلک مان گئے۔ مشاعرہ جمعرات کو ہو گا۔ پٹواری صاحب پہلے ہی ہاں کر چکے ہیں۔ بس تیاری شروع کر دو۔ استاد فلک کہتے ہیں کہ شہر سے بھی شاعروں کو بلوایا جائے اور خوب دھوم دھامی مشاعرہ ہو۔''
''ان کے اخراجات اور ریل کا کرایہ کون دے گا؟'' بابا علیا نے پوچھا۔
''اس کی فکر نہ کرو۔'' استاد نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ قصبے والوں کا پیسہ بھی خرچ نہ ہو گا۔''
''یہ بات ہے تو سبحان اللہ!'' علیا بابا نے کہا۔
کوئی دو گھنٹے بعد استاد فلک سرائے کی کوٹھڑی میں چارپائی پر بیٹھا دھڑا دھڑ، خط لکھ رہا تھا۔ یہ خط لاہور، امرتسر، لائل پور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ وغیرہ کے رہنے والوں کے نام تھے۔ ایک خط جو اس نے لاہور اپنے ایک شاگرد کے نام لکھا۔ اس کے مضمون کا آخری حصہ یہ تھا:

''............اور تم ضرور بالضرور جمعرات سے پہلے ہی یہاں پہنچ جانا۔ تمہاری دکان کا حرج تو ہو گا اور تمہیں ریل کا کرایہ بھی پلے سے خرچ کرنا ہو گا۔ مگر برخوردار! مجھے یقین ہے کہ تم اپنے استاد اور مرشد کی عزت و آبرو کے لیے روپیہ تو کیا جان سے بھی دریغ نہ کرو گے۔ شعروں کی تم فکر نہ کرنا۔ میں پہلے ہی سے لکھ رکھوں گا۔ اور ہاں اگر تم اپنے ساتھ اپنے دو تین دوستوں کو بھی لا سکو تو بہت مناسب ہو گا۔ قائم دین قصائی اگر بری ہو گیا ہو تو اسے میری طرف سے تاکید کر کے ضرور ساتھ لیتے آنا۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم سامان لے کر کل ہی یہاں پہنچ جاؤ۔ اور دو تین دن یہیں دکان لگا لو۔ مگر شاید یہ مناسب نہ ہو۔ بس تم خود ہی چلے آؤ۔ میں پھر تاکید کرتا ہوں۔ وقت پر دغا نہ دے جانا۔

تمہارا استاد
فلک

لفافے پر مکتوب الیہ کا نام یوں لکھا:
فضل دین عرف فضلو عرف خستہ کبابی۔
ادھر ٹھیک اسی وقت گوندنی والے تکیے کے ایک پیڑ کے نیچے قصبے کا پٹواری شمس الدین قصبے کے بعض

بڑے بڑے زمینداروں سے جن میں سلطان کا چچا چودھری رحمت علی بھی شامل تھا، یوں خطاب کر رہا تھا:

''صاحبو! مجھے معاف کرنا کہ میں نے آپ صاحبان کو یہاں تشریف لانے کی زحمت دی۔ میں آپ کو یہ زحمت نہ دیتا اگر معاملہ اتنا نازک نہ ہوتا یا اس میں سارے قصبے کی عزت کا سوال نہ ہوتا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کل سے خدا بخش نے قصبے میں کیا تماشا کر رکھا ہے۔ نہ جانے کہاں سے ایک اُچھال چھکا کو پکڑ لایا ہے جو ہے تو ادھیڑ عمر مگر بناؤ سنگھار میں جوان عورتوں کو مات کرتی ہے۔ اسے کھلم کھلا اپنے ساتھ لئے پھر رہا ہے۔ کل یہاں تکیے میں بھی لے آیا۔ اس نے اولیائی کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے، اس کی وجہ سے پہلے ہی ہمارے قصبے کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ اس پر یہ نیا سوانگ نہ جانے کیا گل کھلائے گا۔ وہ باہر شہروں میں جو چاہے کرتا پھرے ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ لیکن صاحبو! قصبے کے اندر اس قسم کی حرکاتِ شنیعہ کی اسے ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔''

اتنا کہہ کے پٹواری رک گیا اور اپنی مہندی میں رنگی ہوئی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے مخاطبین کے چہروں کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ اس امر کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ استاد فلک پر اس کے حملے کا سننے والوں پر کیا اثر ہوا۔

ان زمینداروں میں ایک بوڑھا چودھری خیر دین بھی تھا۔ تھا تو کمتر حیثیت کا مگر اپنی راستبازی اور صاف گوئی کی وجہ سے قصبے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسے استاد فلک اور برقع پوش عورت کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔

''لیکن پٹواری صاحب!'' اس نے کہا۔ ''میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔ یہ عورت جسے آپ نے اُچھال چھکا بتلایا ہے لاہور کے ایک معزز ٹھیکے دار کی بیوہ ہے۔ اور استاد فلک اپنی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں اسے یہاں لایا ہے۔''

''اجی کہنے کو تو وہ سب سے یہی کہتا پھرتا ہے۔ لیکن چودھری خیر دین صاحب! اس کی بات کا کیا اعتبار! کیا آپ کو اس کی اولیائی پر یقین ہے؟''

''خیر اس قصے کو تو آپ رہنے ہی دیں پٹواری صاحب! آدمی پیٹ کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتا۔ لیکن اس بات کو تو آپ بھی مانیں گے کہ استاد فلک ہمارے قصبے کا مشہور شاعر ہے۔ پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ میرے بیٹے نے لاہور کے ایک مشاعرے کا حال لکھا تھا جس میں استاد فلک نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ میرے بیٹے نے لکھا تھا کہ سب سے زیادہ داد استاد فلک ہی کو ملی۔ اور اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا گیا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس معاملے کی پوری پوری تحقیق نہ ہو جائے ہمیں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ رہی رشتے کی بات تو ہر باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد کے لیے بہتر سے بہتر رشتہ ملے۔ اگر استاد فلک کی بھی یہی کوشش ہے تو اس میں کیا برائی ہے! کیوں چودھری رحمت علی جی؟''

چودھری رحمت علی طبعاً گوشہ گیر اور خاموش سا انسان تھا۔ وہ قصبے کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہتا ہی

پسند کرتا تھا۔ اس نے چودھری خیر دین کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا:
"درست ہے چودھری جی!"
پٹواری نے اب دوسرے وار کے لیے پینترا بدلا۔ وہ کہنے لگا۔
"آپ سب صاحبان کو معلوم ہی ہے کہ میں نے خدا بخش کی بیٹی کو اپنی بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔ خدا بخش نے کہا تھا کہ وہ لڑکی کے روٹی کپڑے کا خرچ ہر مہینے بھیجتا رہے گا۔ لیکن اس دس سال کے عرصے میں حرام ہے جو اس نے پھوٹی کوڑی بھی بھیجی ہو۔ یقین نہ آئے تو آپ اسی سے قسم اٹھوا کے پوچھ سکتے ہیں۔"
عین اس وقت نگینہ سائیں کی کوٹھڑی کے قریب سے جہاں کچھ ملنگ لوگوں کی نظروں سے ہٹ کے سُلفا پی رہے تھے کسی نے ہانک لگائی:
"کوڑی نہ رکھ کفن کو!"
پٹواری نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"خیر روپے پیسے کا کیا ذکر۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اور میری بیوی کو اس لڑکی سے دلی انس ہے۔ اور ہماری تمنا ہے کہ وہ آسودگی سے زندگی گزارے۔ اور کسی اچھے کھاتے پیتے عزت دار گھرانے میں بیاہی جائے۔ اب اگر خدا بخش یہ چاہے کہ میں لڑکی کو پال پوس کے اس کے حوالے کر دوں کہ وہ جہاں چاہے اندھا دھند اسے دھکیل دے یا اپنی کسی دنیاوی غرض کے لئے اسے قربان کر دے۔ تو صاحبو! یہ تو ہونے کا نہیں۔"
یہ کہہ کے پٹواری خاموش ہو گیا۔ اور اپنی عقابی نظروں سے سب زمینداروں کے چہروں کو بھانپنے لگا۔ وہ جلد ہی مطمئن ہو گیا۔ اس کا یہ حربہ کامیاب رہا تھا۔ یا کم از کم بظاہر کامیاب معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ کسی زمیندار نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور یہ محفل خاموشی سے برخاست ہو گئی۔
اسی روز شام کے جھٹ پٹے میں جب زیادہ تر لوگ کسی نہ کسی کام سے چلے گئے تھے اور تکیے میں اِکا دُکا آدمی ہی رہ گئے تھے تو نگینہ سائیں نے اچانک مراقبے سے سر اٹھایا۔ آنکھ کھولی اور شفقت آمیز لہجہ میں کہا:
"آؤ سلطان بابو! تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو۔ آؤ چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ اور بے دھڑک کہو۔"
سلطان کی ہمت بندھی۔ وہ نگینہ سائیں کی جھلنگی چارپائی کے اور قریب آ گیا مگر اس پر بیٹھا نہیں۔
"کیا بات ہے سلطان بابو!"
"مجھے...... مجھے ایک کام میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"
"کس کام میں؟"
"استاد فلک کے بارے میں......
میں چاہتا ہوں کہ جب پنچایت ہو تو مہتاب بی بی کو اس کے باپ کے لائے ہوئے رشتے اور پٹواری کے لنگڑے بھتیجے دونوں سے چھٹکارا دلوا دیا جائے۔"
"وہ کس طرح سلطان بابو؟"
"اس کی شادی کہیں قصبے میں کسی اور نوجوان سے کر دی جائے۔"

''مگر استاد فلک جو رشتہ لایا ہے، اس میں کیا خرابی ہے؟''

سلطان کے ہونٹوں کو لرزش ہوئی مگر زبان سے کچھ نہ نکلا۔ پچھلی رات سرائے کے باہر والے میدان میں استاد فلک اور اس برقع پوش عورت کی نظروں سے اوجھل رہ کر اس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس کو بیان کرنے کے لئے اس سے کہیں زیادہ بے حجابی اور ہمت درکار تھی جس کا وہ اہل نہیں تھا۔ آخر نگینہ سائیں نے اس کی ہمت بندھائی تو اس کا پورا پورا حال تو وہ بیان نہ کر سکا پھر بھی اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہہ گیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟''

''ہاں۔''

''کون؟''

''مولو۔''

''مگر اس کا باپ تو بہت غریب ہے۔''

اس پر سلطان نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی جو رومال میں لپٹی ہوئی تھی، نکال کر نگینہ سائیں کے حوالے کر دی۔

''یہ پانچ سو روپیہ ہے۔ سال بھر ہوا، اباجی نے مجھے رکھنے کو دیا تھا۔ مگر وہ تو چل بسے اور یہ رقم ابھی تک میرے پاس ہی پڑی رہی۔ گھر میں اس کا کسی کو علم نہیں۔ یہ روپیہ مہتاب بی بی کے جہیز کے طور پر مولو اور اس کے باپ کو دے دیا جائے۔ وہ اس سے چھوٹی سی زمین خرید لیں گے اور بخوبی گزارہ کر سکیں گے۔''

کئی لمحوں تک دونوں خاموش رہے۔ اس کے بعد نگینہ سائیں نے اپنی گھمبیر آواز میں کہا:

''سلطان بابو! یہ کام مشکل ہے۔ بہت ہی مشکل! مگر میں اسے سرانجام دینے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نگاہیں بہت کچھ کہہ گئیں جنہیں الفاظ ادا نہ کر سکتے تھے۔ اس کے بعد سلطان تکیے سے چلا گیا اور نگینہ سائیں سر جھکا کر مراقبے میں چلا گیا۔

یوں تو مشاعرے میں چار دن باقی تھے مگر ابھی سے گوندنی والے تکیے میں خاصا ہنگامہ رہنے لگا تھا۔ جہاں دو چار آدمی بیٹھتے، اسی کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی بات جو دیہاتی زندگی کی غیر محدود یکسانیت کو توڑتی ہو، گاؤں والوں کے لیے انتہائی دلچسپی کا موجب بن جاتی ہے اور دوسری وجہ وہ کشاکش تھی جو استاد خدا بخش فلک اور پٹواری شمس الدین میں اب پیدا ہو گئی تھی۔ اور سب لوگ اس سے واقف ہو گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ پٹواری جو گاؤں کے سب چھوٹے بڑے زمینداروں کے لگان وغیرہ کا سرکاری طور پر ذمہ دار تھا۔ بے پایاں اثر و رسوخ کا مالک تھا اور اس کے مقابلے میں استاد فلک جیسے نیم سودائی شاعر کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ مگر چونکہ یہ مشاعرہ دراصل استاد فلک کی پذیرائی ہی میں منعقد کیا جا رہا تھا۔ اور اس میں آس پاس کے دیہات کے علاوہ پنجاب کے بعض بڑے بڑے شہروں کے شعراء بھی حصہ لینے آ رہے تھے اور ظاہر تھا کہ شعر و سخن کے دلدادگان کو ایک شاعر کے مقابلے میں کسی پٹواری سے کیا ہمدردی ہو سکتی

ہے۔ اس لیے اس مشاعرے نے دونوں طرف کی طاقتوں میں خواہ وقتی طور پر سہی، ایک عجیب طرح کا توازن پیدا کر دیا تھا اور لوگ بڑے اشتیاق سے اس ادبی اجتماع کے منتظر تھے جو ممکن ہے اپنے اندر کسی بڑے سماجی ہنگامے کا سامان رکھتا ہو۔

پٹواری اس صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اور اگر چاہتا تو مشاعرے کے انعقاد میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر سکتا تھا۔ مگر ایک تو مشاعرے کی تجویز پر سب سے پہلے اسی نے صاد کیا تھا۔ دوسرے سب گاؤں والے مشاعرے کے حق میں تھے۔ اس لئے اس نے فی الحال خاموش اور اس معاملے سے الگ تھلگ رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔

اُدھر استاد فلک نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس کو عمل میں لانے کے لیے وہ پورے طور پر سرگرم تھا۔ شہروں سے جن شاعروں کو اس نے بلوایا تھا۔ ان کی حمایت کا تو اسے یقین تھا ہی، وہ مقامی شعراء کو بھی اپنے ساتھ ملانے کے لیے پوری پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ ان میں سے کچھ اس کے اپنے ہونہار شاگرد تھے۔ جن کو اس نے اپنی شاعری اور اپنے جذب و کشف کا معتقد بنا کے شہرت اور کامیابی کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے تھے۔

اس سلسلے میں تکیے کے متولی نگینہ سائیں کی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اس نے مشاعرے کا اہتمام ایسے جوش و خروش سے شروع کر دیا تھا جیسے بہت بڑی تقریب ہونے والی ہو۔ ہر چند استاد فلک نے کہا تھا کہ اس مشاعرے پر قصبے والوں کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا۔ مگر نگینہ سائیں نے زمینداروں کے گھروں میں جا جا کے باقاعدہ چندہ اُگاہنا شروع کر دیا تھا۔

دیہات کے لوگ ویسے ہی مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اس پر یہ جان کر کہ شہروں سے شاعر آنے والے ہیں اور قصبے کی عزت کا سوال ہے، وہ خود ہی تکیے میں آ آ کے نگینہ سائیں کو طرح طرح کی امداد پیش کرنے لگے۔ کسی نے کہا آدھ سیر مکھن میں روزانہ بھیج دیا کروں گا۔ کسی نے کہا۔ حقے کے لیے تمباکو اور گڑ میرے گھر سے آ جایا کرے گا۔ کسی نے کہا۔ ساگ پات ہر روز تازہ تازہ میرے کھیت سے منگوا لیا کریں۔ کسی نے کہا۔ دو ایک مہمانوں کو یہ خاکسار اپنے ہاں ٹھہرا لے گا۔ مگر نگینہ سائیں اور استاد فلک دونوں کی یہی رائے ٹھہری کہ سب مہمانوں کو تکیے ہی میں ٹھہرایا جائے۔

مشاعرے کی شب کے لئے گیسوں کا انتظام کیا گیا۔ مہمانوں کی ضیافت کے لئے اجناس فراہم ہونے لگیں۔ دیگیں، برتن، دریاں، چارپائیاں، مُٹھے، تکیے میں پہنچنے لگے۔ یہ رنگ دیکھ دیکھ کے استاد فلک پھولا نہ سماتا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ مشاعرے کا اہتمام اس ٹھاٹھ سے کیا جائے گا۔ وہ خوش طبعی سے نگینہ سائیں سے کہنے لگا:

"سائیں بادشاہ! خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ نے میری مدت کی آرزو پوری کر دی۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ یہ مشاعرہ ہے یا میری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے؟"

نگینہ سائیں پہلے تو کھوئی کھوئی نظروں سے استاد کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ مسکرایا۔ اور نیم دیوانگی و نیم فرزانگی کے عالم میں کہنے لگا۔

''جو چاہو سمجھ لو فلک جی! مولا کے رنگ نیارے ہیں۔ پل بھر میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ اللہ جی، اللہ جی، اللہ جی......''

یہ کہتا ہوا اور اپنی کمبلی سنبھالتا ہوا وہ اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔

....

مشاعرے سے دو دن پہلے ہی مہمان آنے شروع ہو گئے۔ پہلا قافلہ لاہور سے آیا۔ اس میں تین شاعر تھے۔ ایک ادھیڑ عمر اور دو نوجوان۔ پہلے ادھیڑ عمر بڑی گرم جوشی سے استاد سے بغل گیر ہوا۔ اس کے بعد دونوں نوجوانوں نے بڑی عقیدت سے استاد کے پاؤں کو چُھوا۔ استاد نے شفقت سے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ شام ہوتے ہوتے امرتسر سے اور بھی دو شاعر آ گئے۔ ان سب کو تکیئے ہی میں ٹھہرایا گیا۔

ان پانچ آدمیوں کے آنے کی خبر قصبے بھر میں پھیل گئی اور لوگ انہیں دیکھنے کے لئے جوق در جوق تکیے میں آنے لگے۔ علاوہ ازیں کئی عورتیں بھی لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے کمر پر مٹکا اٹھائے تکیے کے کنوئیں پر جمع ہو گئیں۔

قصبے والے بڑے تپاک سے ان شاعروں سے مصافحہ کرتے، شہر کی خیر خبر پوچھتے اور پھر یہ دریافت کرتے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ایک نوجوان منچلا شاعر کہیں یہ پوچھ بیٹھا کہ ادھر کوئی اکھاڑہ بھی ہے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ راتوں رات کئی موگریاں اور مگدر تکیے میں پہنچا دیے گئے۔ اگلے روز منہ اندھیرے، یہ نوجوان لنگوٹ کس، بدن پر تیل مل، ڈنٹر پیلتا اور موگریاں پھیرتا ہوا نظر آنے لگا۔

مشاعرے سے ایک روز قبل تک پندرہ سولہ شاعر تکیے میں پہنچ چکے تھے۔ یہ لوگ لاہور اور امرتسر کے علاوہ گوجرانوالہ، لائلپور، سیالکوٹ، قصور وغیرہ شہروں سے آئے تھے۔ ایک شاعر چنیوٹ سے اس مشاعرے میں شرکت کے لئے آیا تھا۔

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے استاد فلک حسب معمول گیروے رنگ کے کپڑے پہنے، سیپ کے دانوں کی تسبیح کلائی پر لپیٹے، بید کی چھڑی تھامے ان شاعروں کے جلو میں تکیے سے نکلا۔ موتیا کے پھولوں کا ایک ہار جو اس کے کسی شاگرد نے خود بڑھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا تھا اور جس کے پھول اب باسی ہو چکے تھے ابھی تک اس کے گلے میں پڑا تھا۔ وہ اپنے مہمانوں کو قصبے کے باہر دیہات کی کھلی فضاؤں میں ذرا گھمانے پھرانے کے لئے لے کر جا رہا تھا۔

ایک میدان میں قصبے کے کچھ نوجوان کبڈی کھیل رہے تھے۔ استاد فلک ان کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ سب بڑی دلچسپی سے اس کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک استاد فلک نے اس کسرتی جسم والے من چلے نوجوان کی طرف دیکھا جس نے پچھلے روز اکھاڑے کے بارے میں پوچھا تھا۔

''ہاں بھئی چھبے خان اذرا نکلو تو تم بھی میدان میں۔''

استاد کا اشارہ پانے کی دیر تھی۔ چھبے خان نے جھٹ پٹ اپنا کرتہ اور تہمد اتار ڈالا۔ جس کے نیچے اس نے سرخ رنگ کا جانگیا پہلے ہی سے کس رکھا تھا۔ وہ علی علی کرتا ہوا میدان میں کود پڑا۔

آخر مشاعرے کا دن آ گیا۔ صبح ہی سے گوندنی والے تکیے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کا کام شروع ہو گیا۔

مہمانوں کے لئے گوندنی کے پیڑوں کے نیچے جو چارپائیاں بچھا دی گئی تھیں انہیں اٹھوا دیا گیا۔ شاعروں کے بیٹھنے کے لئے اینٹوں کا ایک عارضی چبوترا بنایا گیا اور اس کے اوپر پہلے چٹائیاں اور پھر دریاں بچھا دی گئیں۔ اور وسط میں صدرِ مشاعرہ کے لیے سرخ مخمل کا ایک گاؤ تکیہ رکھ دیا گیا جو ایک مرفعہ الحال زمیندار کے ہاں سے حاصل کر لیا گیا تھا۔

چبوترے کے دونوں جانب گیت نصب کیے گئے۔ سامعین کے بیٹھنے کے لئے اس چبوترے کے آس پاس دریاں بچھا دی گئیں۔ تکیے کے دروازے کو کھجور کی شاخوں سے آراستہ کیا گیا۔ ساتھ ہی سرخ اور سبز رنگ کی جھنڈیاں بھی لگا دی گئیں۔ جیسی شادی بیاہ کے موقعوں پر بیاہ والے گھر کے باہر لگائی جاتی ہیں۔ قصبے والوں نے ان جھنڈیوں کو تعجب کی نظروں سے دیکھا اور بعض تنک چڑھوں نے اس پر ناک بھوں بھی چڑھائی۔ اور اسے اسرافِ بے جا سے تعبیر کیا۔ مگر تکیے والے سائیں کے سامنے کسی کو بھی چوں کرنے کی مجال نہ ہوئی۔ ان آرائشی کاموں کو سلطان، مولو اور قصبے کے دوسرے لڑکوں نے بڑی محنت سے سرانجام دیا تھا۔

مشاعرے کے لئے شام کا وقت رکھا گیا تھا تاکہ قصبے کے سب لوگ کھیتوں میں اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر آ جائیں۔ مگر لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بعض تو ظہر کی نماز کے بعد ہی کام سے فراغت پا کر تکیے میں آ جمع ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں آس پاس کے دیہات سے بھی بہت سے لوگ مشاعرہ سننے کے شوق میں کھنچے چلے آئے تھے اور گوندنی والے تکیے میں میلے کا سا سماں بندھ گیا تھا۔

شام ہوتے ہوتے تکیے میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ جب مشاعرہ شروع ہونے کا وقت آیا تو زمینداروں نے دیکھا کہ ان میں پٹواری شمس الدین نہیں ہے۔ فوراً ایک آدمی کو اس کے گھر بھیجا گیا۔ پٹواری پچھلے چار دنوں میں بہت کم تکیے میں دیکھا گیا تھا۔

وہ ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے گھر ہی میں پڑا رہا تھا۔ مگر اب جب اسے پیغام پہنچا کہ سب لوگ اس کے منتظر ہیں اور اسی وجہ سے مشاعرہ ابھی تک شروع نہیں کیا گیا تو اس نے گھر پر رہنا خلافِ مصلحت سمجھا اور خاموشی سے آ کر ایک کونے میں جہاں کچھ زمیندار بیٹھے تھے وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔

اب سب کی نظریں استاد فلک کی طرف اٹھنے لگیں جو شاعروں کے بیچوں بیچ برات کا دولہا بنا بیٹھا تھا۔ لوگوں کو اپنا مشتاق پا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور صدر کی نشست کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجمع پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ مسکرایا اور پھر بڑے جلالی انداز میں بولنا شروع کیا۔

ابتدا میں کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیونکہ اس کی تقریر میں صوفیانہ استعارات و تمثیلات کی کثرت تھی جن سے دیہات کے سیدھے سادے لوگ واقف نہ تھے۔ مگر جب اس نے ظالموں کا تذکرہ کیا تو تقریر میں خاصی سلاست پیدا ہو گئی۔ اس نے بیان کیا کہ کس طرح باری تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے انہیں وقتی طور پر دولت اور اقتدار سے نوازتا ہے اور ان میں جو انسان رذیل ہوتے ہیں وہ کس طرح دولت و شہرت کے نشے میں اندھے ہو کر کمزوروں اور زیردستوں پر ظلم کرنے لگتے ہیں اور بالآخر عذابِ الٰہی کا شکار ہوتے ہیں۔

جس وقت وہ خدا کے قہر و غضب کا تذکرہ کر رہا تھا تو اس پر جذب کی کیفیت طاری تھی۔ اور زورِ بیان

کا یہ عالم تھا کہ منہ سے کف اُڑ رہا تھا۔ قصبے والے استاد فلک اور پٹواری کے تنازعے سے واقف تھے خوب سمجھتے تھے کہ ظالم کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ ادھر پٹواری بھی اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھا۔ مگر مصلحت وقت اسی میں تھی کہ وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا سنتا رہے۔

جب استاد نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو اس نے سلطان بابو کے چچا چودھری رحمت علی سے درخواست کی کہ وہ مشاعرے کی صدارت کے فرائض انجام دیں۔ چودھری صاحب نے کسی قدر تامل اور انکسار کے ساتھ اس اعزاز کو قبول کر لیا۔ استاد نے انہیں مشاعروں کے وسط میں گاؤ تکیے کے پاس لے جا کر بٹھا دیا اور ایک کاغذ جس پر شعراء کے نام ترتیب وار لکھے تھے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

چودھری صاحب نے کاغذ پر نظر ڈالی اور کسی قدر لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا:

''سب سے پہلے میں جناب فقیر محمد برچھی سیالکوٹی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر آ کر حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں۔''

مجمع میں سے ایک صاحب اٹھے۔ ناٹا قد، مگر بھاری بھرکم جسم، تن پر ململ کا گرتہ، لٹھے کا تہد، سر پر سفید صافہ، کُرتے کے اوپر سیاہ رنگ کی واسکٹ جس کے ایک کاج سے جیبی گھڑی کی ایک رو پہلی زنجیر لٹکی ہوئی، خش خشی داڑھی، مونچھوں کے سرے رخساروں سے باہر نکلے ہوئے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں سُرمے کے ڈورے۔ انہوں نے صدر کے قریب کھڑے ہو کر حاضرین پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بڑی بے تکلفی کے انداز میں کہا:

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! حاضرین نے بھی ویسی ہی بے تکلفی کے انداز میں جواب دیا۔

اس پر انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ پھر بولے۔

''پہلے میں اپنے استاد حضرت عشق مرحوم کے چند بیت تبرک کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

بھاویں اَج وی سُولیاں گڈیاں نیں
بُھلدی اج وی گل منصور دی نئیں
جیہڑی گل کیتی اوہنے دار اُتے
بھردے لوک نے وِچ بزار کردے

(خواہ آج بھی سولیاں گڑی ہیں۔ لیکن منصور کی بات آج بھی بھولتی نہیں۔ جو بات اس نے سولی پر کی تھی۔ آج لوگ بھرے بازار میں کر رہے ہیں)

اس شعر پر ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور اٹھا اور نگینہ سائیں کے ایک مست چیلے نے جو مشاعرے کے باہر لوگوں سے ذرا ہٹ کر گوندنی کے ایک پیڑ کے نیچے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اچانک اونچی آواز سے ''اللہ ھو'' کا نعرہ لگایا۔

جناب فقیر محمد برچھی نے اپنے استاد کا دوسرا شعر پڑھا۔

کدی میل ملاپ دی وا وگدی
بھانبڑ سینیاں دے وچ بال دیندی
لبو ہجر فراق دی اگ والے
کدی سینیاں نوں ٹھنڈے ٹھار کر دے

(کبھی میل ملاپ کی ہوا چلتی ہے جو سینوں میں
الاؤ جلا دیتی ہے اور کبھی ہجر فراق کے شعلے سینوں کو ٹھنڈا
کر دیتے ہیں)

اس شعر پر بھی لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔

کر کے اسی وی پیار قصور کیتا
وسر جان دی اونہاں وی حد کیتی
مڑ کے دلاں دی سار نہ مول لیندے
جیہڑے اکھیاں نوں گنہ گار کردے

(ہم نے بھی محبت کر کے قصور کیا اور انہوں نے بھی بھلا دینے میں حد کر دی۔ وہ جو
آنکھوں کو گنہ گار کرتے ہیں، دلوں کی کب خبر لیتے ہیں)

کتے سسی نوں سِک دلدار دی اے
کتے ہیر دی کوک وِنگار دی اے
تھلاں، پربتاں، جنگلاں، بیلیاں نوں
چلے عشق ہوری مار و مار کر دے

(کہیں سسی کو اپنے دلدار کا قلق ہے اور کہیں ہیر آہ و بکا کر رہی ہے۔ اور حضرتِ عشق
ہیں کہ میدانوں، پربتوں، جنگلوں اور ویرانوں کی طرف مارا مار چلے جا رہے ہیں)۔

استاد عشق مرحوم کے ان اشعار پر ابھی تحسین و آفرین کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ سلطان نے دور سے
مولو کو ایک قطار میں بیٹھے دیکھا۔ اور وہ بمشکل مجمعے میں سے گزر کر اس کے پاس پہنچا اور جھک کر اس کے
کان میں کہنے لگا:

"جلدی سے باہر نکل آؤ۔ بہت ضروری بات ہے۔"

مولو چپ چاپ اٹھ آیا۔ اور وہ دونوں تکیے سے باہر نکل گئے۔

"کیا بات ہے بابو!" مولو نے پوچھا۔

"تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

"سرائے کی طرف جہاں استاد فلک اور وہ برقعے والی عورت ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

کوئی دس منٹ میں وہ سرائے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ٹھیکیدارنی ایک کوٹھڑی کے باہر کھڑی

چارپائی پر بیٹھی ہے۔ گرمی سے برا حال ہے۔ دوپٹہ سر سے سرکا ہوا ہے۔ کھجوری پنکھا ہاتھ میں ہے۔ جسے وہ منہ اور سینے پر زور زور سے جھلے جا رہی ہے۔

''بیگم صاحب!'' سلطان نے بڑے ادب کے ساتھ ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر پکارا۔

''کون ہے؟'' وہ چونک اٹھی۔ چہرے کو جلدی سے پنکھے کی اوٹ میں کر لیا۔ اور سر پر دوپٹے کو درست کرنے لگی۔

''مجھے چچا فلک نے بھیجا ہے۔ چودھری حشمت علی مرحوم کا بیٹا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا اس روز جب آپ تکیے میں آئی تھیں تو چچا فلک نے مجھے گلے لگایا تھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا؟''

''ہاں ہاں یاد ہے۔ مگر بات کیا ہے؟''

''ابھی عرض کرتا ہوں۔ چچا فلک اور میرے والد میں سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر دوستی تھی۔ اور چچا فلک کو جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی تو وہ سیدھے والد صاحب ہی کے پاس آیا کرتے تھے۔ کرتے تھے اس گاؤں میں آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔''

''وہ تو میں سمجھ گئی۔ آگے کہو۔''

''وہ بات یہ ہے چچا فلک نے بڑی تاکید کے ساتھ کہلا بھیجا ہے کہ آپ اسی وقت نو چالیس کی گاڑی سے لاہور چلی جائیں۔ بلکہ انہوں نے مجھے ٹکٹ کے روپے بھی دے دیئے ہیں کہ آپ کو ڈیوڑھے درجے میں سوار کرا آؤں۔''

''ہائیں، وہ کیوں؟'' عورت نے حیران پریشان ہو کے پوچھا۔

''اس لیے کہ آج تکیہ میں ضرور خون خرابہ ہوگا۔''

''خون خرابہ؟ کیسا خون خرابہ؟ وہاں تو مشاعرہ ہو رہا ہے۔''

''جی ہاں مشاعرہ تو ہو رہا ہے۔ مگر مشاعرے کے باہر غنڈے کلہاڑیاں لئے کھڑے ہیں۔''

''غنڈے؟ کون سے غنڈے؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہ غنڈے جنہیں پٹواری نے دوسرے گاؤں سے بلوا رکھا ہے۔ بات یہ ہے بیگم صاحبہ کہ چچا فلک نے لاہور سے اپنی حمایت کے لئے جو شاگرد بلوائے ہیں ان میں ایک فضلو کبابی ہے۔ ایک چھجے خان پہلوان ہے۔ ایک قائم دین قصائی ہے، یہ تینوں تکیے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ جو سامان لے کر آئے ہیں کل کہیں پٹواری کے کسی مخبر نے اس میں تیز تیز چھریاں اور لمبے لمبے چاقو دیکھ لئے۔ بس پھر کیا تھا اس نے فوراً جا کر پٹواری کے کان بھر دیئے کہ اپنی خیر چاہتے ہو تو تم بھی کچھ بندوبست کر لو۔

پٹواری نے فوراً اِدھر اُدھر کے گاؤں سے کچھ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کو اپنی حمایت کے لئے اکٹھا کر لیا۔ وہ کھلم کھلا کہتے پھرتے ہیں کہ ہم بھی دیکھیں گے کہ خدا بخش کس طرح تھبے سے لڑکی کو لے کے جاتا ہے۔ اور ہم اس ٹھیکیدارنی سے بھی سمجھ لیں گے جو اسے لینے کے لئے آئی ہے۔

غضب یہ ہوا کہ استاد کے شاگرد وجیہہ خاں نے جو بڑا منچلا نوجوان ہے کسی بات پر پٹواری کے ایک آدمی کو تھپڑ دے مارا۔ بس پھر کیا تھا اسی وقت چاقو نکل آئے۔ دو تین کا خون ہو گیا ہوتا۔ وہ تو خیریت گزری کہ میرے چچا چودھری رحمت علی نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ مگر دونوں طرف کے لوگوں کے دلوں میں غبار بھرا ہوا ہے۔ اور وہ انتظار میں ہیں کہ مشاعرہ ختم ہو تو غبار نکالیں۔

چچا فلک نے مجھے الگ لے جا کر یہ ساری باتیں سمجھا دیں اور تاکید کر دی کہ آپ کو جلد سے جلد سرائے سے نکال لے جاؤں۔ کہا کہ خود ٹکٹ خرید کے گاڑی میں بٹھانا اور جب تک گاڑی روانہ نہ ہو، پلیٹ فارم ہی پہ موجود رہنا۔ بس آپ میرے ساتھ چلیے۔ یہ لڑکا اسباب اٹھا لے گا۔ راستے میں کوئی ٹم ٹم مل گئی تو کرایہ کر لیں گے ورنہ پیدل ہی اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔ دیکھئے اس وقت نو بج چکے ہیں۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔ بس جلدی کیجئے اور سامان باندھ لیجیے۔"

سلطان کی یہ لمبی تقریر سن کے ٹھیکیدارنی کی سٹی گم ہو گئی۔ منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ کوٹھڑی کے اندر جو دِیا جل رہا تھا اس کی روشنی بڑی مدھم تھی اور یہ سلطان کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اپنی لمبی تقریر کے دوران سلطان کے چہرے کی جو کیفیت ہو رہی تھی، اور اس کی پیشانی سے پسینے کے جو ہزاروں قطرے ٹپک رہے تھے، ٹھیکیدارنی انہیں نہ دیکھ پائی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

بالآخر اس نے زبان کھولی۔ "تم ذرا جا کے استاد فلک کو بلا نہیں لاتے۔ بس دو منٹ کے لئے۔"

"ناممکن ہے۔" سلطان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مشاعرہ شروع ہو چکا ہے اور چونکہ مشاعرے کا انتظام وہ خود کر رہے ہیں۔ دو منٹ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اور اگر کسی بہانے وہ اٹھ بھی آئے تو کیا تکیے سے نکلتے ہی پٹواری کے غنڈے ان کے پیچھے نہ لگ جائیں! پھر انہوں نے اس بات کی بھی تاکید کی تھی کہ یہ کام بہت چپ چپاتے ہونا چاہیے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ پہنچے کہ آپ قصبے سے جا رہی ہیں۔"

"میری عقل تو کچھ کام نہیں کرتی۔" ٹھیکیدارنی نے بڑی پریشانی اور مایوسی کے عالم میں کہا۔

"آپ کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بس سامان باندھ لیجیے۔"

"اپنے آنے کے متعلق کچھ نہیں کہا؟" اچانک ٹھیکیدارنی نے پوچھا۔

"کہا کیوں نہیں۔" سلطان نے برجستہ کہا۔ "کہتے تھے کہ اگر خیریت گزری تو میں کل ہی ورنہ پرسوں ضرور سوار ہو جاؤں گا۔ کیا کیا چیزیں ہیں آپ کی؟ مولو ادھر آؤ۔"

"چیزیں تو کچھ زیادہ نہیں۔ بس ایک چھوٹا سا ٹرنک ہے اور ایک بقچہ ہے۔"

"اچھا تو مولو ٹرنک تم اٹھا لو۔ مگر اس طرح لے جانا کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ میں بقچہ اٹھا لیتا ہوں۔ سرائے والا اس وقت گھر چلا جایا کرتا ہے۔ کیونکہ یہاں کبھی کبھار ہی کوئی مسافر آ کے ٹھہرتا ہے آپ برقع اوڑھ لیجیے

اور میرے پیچھے پیچھے آیئے۔"

"اچھا۔" ٹھیکیدارنی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

اس کا جی جانے کو مطلق نہیں چاہتا تھا۔ مگر سلطان نے معاملے کی نزاکت کو کچھ ایسی وضاحت سے بیان کیا تھا اور ایسی عمدگی سے کڑی سے کڑی ملائی تھی کہ اس کے سچ ہونے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔

سلطان کو اپنی قوتِ کلام پر خود اچنبھا ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی سراغرسانی کے ان ناولوں کا کوئی کردار ہے جنہیں وہ گوندنی کے پیڑوں پر چڑھ کے بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

ادھر ٹھیکیدارنی چھبے خان پہلوان کا حال خود استاد فلک کی زبان سے سن چکی تھی کہ کس طرح اس نے کبڈی اور دوسرے کھیلوں میں اپنے داؤ پیچ دکھا کے دیہات کے نوجوانوں پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ چنانچہ اس نے برقع اوڑھا اور بادل ناخواستہ سلطان کے پیچھے پیچھے چل دی۔ مصلحتاً کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا گیا۔ مگر دِیا بجھا دیا گیا۔

سرائے کے دروازے پر نہ تو انہیں سرائے والا ملا۔ اور نہ کسی اور شخص سے مڈبھیڑ ہوئی۔ سلطان ٹم ٹم کرایہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ایسے راستے سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا جدھر ٹم ٹم ملنے کا کم سے کم امکان ہو سکتا تھا۔ آخر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گاڑی کے وقت سے کوئی پندرہ بیس منٹ پہلے اسٹیشن پہنچ گئے۔ سلطان نے ٹکٹ خریدا۔ گاڑی آئی اور ٹھیکیدارنی کو ڈیوڑھے درجے کے زنانہ ڈبے میں بٹھا دیا گیا۔

گاڑی کی روانگی کے انتظار میں چند منٹ سلطان نے پلیٹ فارم پر گزارے ان کی طوالت کو کچھ اسی کا دل جانتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے جب گاڑی چلی تو اس کی جان میں جان آئی۔ ٹھیکیدارنی نے چلتے چلتے سلطان کو اس کی سلامتی اور درازیٔ عمر کی بہت سی دعائیں دیں جن پر وہ بعد میں بہت ہنسا۔

جب وہ تکیے میں واپس پہنچے تو کوئی ساڑھے دس بجے کا عمل ہوگا۔ مشاعرہ ابھی تک جاری تھا۔ بہت سے دیہاتی جورات کو جلد سو جانے کے عادی تھے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ پھر بھی خاصا بڑا مجمع تھا۔ مشاعرے کی سنجیدگی ختم ہو چکی تھی اور اب لوگ خوش طبعی پر مائل تھے۔

چھبے خان کو جس کے مزاحیہ اشعار سن کر اہلِ مشاعرہ حد درجہ محظوظ ہوئے تھے اب تیسری مرتبہ بڑے اصرار کے ساتھ اسٹیج پر بلوایا گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"وال دلبرا رب دا واسطہ ای

"وال......(بلند آواز سے) اور وال!"

اس پر بابا علیا کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی، جلدی سے اٹھ کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"فرماؤ حضور! کیا کام ہے؟ غلام حاضر ہو گیا۔"

اس پر سب لوگ مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

اس کے بعد مشاعرہ برخاست ہو گیا۔

آدھی رات جا چکی تھی کہ استاد فلک اپنے شاگردوں کے جلو میں گوندنی والے تکیے سے نکلا اور قصبے کی سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا کیونکہ مشاعرہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کے کامیاب رہا تھا۔ اور اس کا سہرا اسی کے سر تھا۔ یہ امر پٹواری کو نیچا دکھانے اور اس پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ کوئی تک بند نہیں ہے بلکہ ملک کا ممتاز شاعر ہے جس کی ایک دنیا قدرداں ہے۔

مشاعرے کے دوران میں استاد فلک اور اس کے شاگردوں نے اپنے اشعار میں پٹواری پر خوب خوب چوٹیں کی تھیں۔ مگر پٹواری ایک ہی کائیاں تھا۔ ایسی چپ سادھی جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔ دل میں کہتا تھا، یہ مشاعرے کا ہنگامہ جائے پھر استاد کو مزا چکھاؤں گا۔

تھوڑی دیر میں وہ لوگ سرائے کے پاس پہنچ گئے۔ شاگردوں نے حسب معمول بڑی گرم جوشی کے ساتھ استاد سے مصافحہ کیا۔ استاد نے دعائیں دیں اور انہیں رخصت کر کے خوشی خوشی سرائے میں داخل ہوا تاکہ ٹھیکیدارنی کو اپنی کامیابی کا مژدہ سنائے۔

"خورشیدا!" اس نے تاریکی میں بڑی ملائم آواز سے پکارا۔ مگر ٹھیکیدارنی کی کوٹھڑی سے کوئی جواب نہ ملا۔

"خورشیدا!" اس نے دوبارہ کہا۔ "سو رہی ہو؟"

اب بھی کوئی جواب نہ پا کر استاد کو کچھ حیرانی ہوئی چارپائی کو ٹٹولا۔ تو وہ خالی پڑی تھی۔ کوٹھڑی کے اندر دیا سلائی جلا کر دیکھا تو وہاں سناٹا تھا۔ ٹھیکیدارنی اپنے ساتھ جو سامان لائی تھی وہ بھی غائب تھا۔ اب استاد اپنی کوٹھڑی کی طرف گیا۔ جس کے دروازے میں ہمیشہ کُنڈی لگی رہتی تھی۔ استاد کا بستر اور بیگ موجود تھا۔ اور دیوار پر کیل سے اس کی خاکِ شفا کی تسبیح بھی جوں کی توں لٹک رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ ان چیزوں کو چھوا نہیں گیا۔

کوٹھڑی سے نکل کر وہ سرائے کے صحن میں اِدھر اُدھر گھوما۔ اور پھر سرائے والے کے گھر کی طرف چل دیا جو قریب ہی تھا۔ سرائے والا گھر سے باہر چارپائی پر سو رہا تھا۔ اسے ہلا کر جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"کون؟"

"میں ہوں خدا بخش۔ ٹھیکیدارنی کہاں ہے؟"

"وہیں ہوگی سرائے میں۔"

"وہاں تو نہیں ہے۔"

"میں نے شام کو اسے اس کی کوٹھڑی ہی میں دیکھا تھا۔"

اچانک استاد کو خیال آیا کہ اس بات کا چرچا کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ اس نے فوراً لہجہ بدل کر دل جمعی کے ساتھ کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ یہیں کہیں ہوگی۔ میں معلوم کر لوں گا۔ تم سو جاؤ۔"

دوبارہ سرائے میں آ پہنچا۔ اب کے ایک ایک کوٹھڑی دیکھ ڈالی۔ مگر ٹھیکیدارنی کا پتہ نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کدھر جائے، کہاں تلاش کرے۔

آخر وہ تکیے کی طرف چل پڑا۔ وہاں بھی اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ اس کے شاگرد اور مہمان مشاعرے کی تکان کی وجہ سے چارپائیوں پر پڑتے ہی بے خبر سو گئے تھے۔ یہی حال نگینہ سائیں کے چیلوں کا تھا جو چٹائیوں پر پاؤں پسارے نیند میں مدہوش تھے۔

جب استاد اپنے شاگرد جیبے خاں کی چارپائی کی طرف بڑھ رہا تھا تو اچانک پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ گھمبیر مگر دھیمی دھیمی سی۔

''استاد فلک جی۔''

وہ فوراً پہچان گیا۔ وہ نگینہ سائیں تھا جو اپنی کملی اوڑھے ایک سائے کی طرح اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ سائیں نے استاد کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''انہیں نہ جگاؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

استاد حیرانی سے سائیں کا منہ تکنے لگا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ سائیں تکیے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں گ۔ ر۔ کے اس میدان میں پہنچ گئے جہاں گائیں بھینسیں چرا کرتی تھیں اور جو سرائے سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ استاد کا استعجاب ابھی دور نہیں ہوا تھا۔

سائیں نے کہا۔ ''یہاں بیٹھ جاؤ۔ اور جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سنو!''

استاد گھاس پر بیٹھ گیا۔ سائیں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا:

''تم کو خورشید کی تلاش ہے؟''

''ہاں۔ مگر آپ کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟'' استاد نے متحیر ہو کر پوچھا۔

اس کے جواب میں سائیں نے ایک پراسرار و طویل قہقہہ لگایا۔

''خورشید چلی گئی اور یہ اس کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ تم اب اس قصے کو چھوڑ دو۔ اور جو کچھ میں کہتا ہوں اس پر دھیان دو۔ یہ عورت جس کو تم ٹھیکیدارنی ظاہر کر رہے ہو میں جانتا ہوں کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور تمہاری بیٹی سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ اپنے مطلب کی خاطر وہ تم سے جھوٹی محبت ظاہر کر رہی ہے۔ اور تم دنیا کا اتنا تجربہ رکھنے کے باوجود اس کے مکروفریب کا شکار ہو گئے ہو۔ دیکھو ہوش میں آؤ۔ ہوس کے پتلے نہ بنو۔ یاد رکھو کہ ایک باپ کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تم پر کچھ فرض عائد کیے ہیں۔ جن کو تم اپنی نفسانی خواہشات کی ہوس میں بھول چکے ہو۔ آج تمہارے سر پر نفسانیت کا جو نشہ سوار ہے۔ ایک دن آئے گا کہ یہ نشہ اتر جائے گا اور تمہیں اپنی حماقتوں کا احساس ہو گا۔''

''اگر یہ معاملہ صرف تمہاری ہی ذات تک محدود ہوتا تو شاید میں دخل نہ دیتا۔ مگر یہ ایک معصوم لڑکی کا معاملہ ہے جسے میں نے ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہے۔ اس کی عزت سارے قصبے کی عزت ہے۔ تم نے مشاعرے کے پردے میں جو چال چلی تھی میں پہلے ہی روز اس سے واقف ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں نے تمہاری خواہش کو پورا کیا اور پٹواری کو نیچا دکھانا پڑا۔

''یہ نہ سمجھو کہ مجھے پٹواری کے ارادوں کا علم نہیں۔ مگر یقین رکھو کہ اسے بھی اپنی حرص و ہوا کی سزا ملے گی۔ تنہا میں ہی نہیں سارا قصبہ تمہاری بیٹی کا محافظ ہے۔ ہم کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں گے جس سے اس

غریب کی زندگی برباد ہو جائے۔

میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ تم بڑے شاعر ہو بلکہ اس لئے کہ ہم تم دونوں ایک ہی مٹی میں پلے بڑھے ہیں۔ خدا نے تم کو شہرت دی ہے۔ تم سے ہمارے قصبے کی آبرو ہے۔ اور میری تمنا ہے کہ یہ آبرو ہمیشہ قائم رہے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔''

نگینہ سائیں کی یہ طولانی تقریر سن کر استاد گم سم رہ گیا۔ بیچ بیچ میں کئی بار اس کے ہونٹ ہلے۔ مگر زبان سے کوئی لفظ وا نہ ہو سکا۔ چند لمحوں تک دونوں خاموش رہے۔ اس کے بعد اچانک استاد ''مینڈھا سائیں بادشاہ، مینڈھا سائیں بادشاہ'' کہتا ہوا بے تابانہ اس سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

''میں گنہگار ہوں۔ مجھے بخش دو۔ مجھے بخش دو۔'' اس نے گڑ گڑا کر کہا۔

نگینہ سائیں خود بھی آبدیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے استاد فلک کو سینے سے لگایا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو خطاؤں سے چشم پوشی کر کے اپنی آغوش اس کے لیے کھول دے۔

صبح ہوتے ہی یہ خبر سارے قصبے میں پھیل گئی کہ گوندنی والے تکیے کا سائیں پنچایت کرانا چاہتا ہے۔ جس میں قصبے کے سب زمینداروں اور کسانوں کو بلوایا گیا ہے۔ پچھلے تین چار دن سے قصبے والے جو استاد فلک اور پٹواری کی باہمی کشمکش سے بخوبی واقف تھے ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے اس اقدام کے منتظر تھے مگر نگینہ سائیں کی طرف سے جو قصبے کی معاملات سے ہمیشہ الگ تھلگ ہی رہتا تھا، اس کا اعلان ہونا سب کے لیے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔

دوپہر کے بعد لوگ پنچایت کے سلسلے میں تکیے میں آنا شروع ہو گئے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کے ہاتھ میں بٹیر تھا اور بغل میں ململ کا ہلکا پھلکا تھیلا جس میں وہ بٹیر کو رکھا کرتے تھے۔

لوگ آتے جاتے تھے۔ اور چٹائیوں پر بیٹھتے جاتے تھے۔

تکیے میں جو لوگ شطرنج، چوپڑ یا تاش کھیلنے میں مصروف تھے انہوں نے اپنے کھیل موقوف کئے اور مجمعے میں آ بیٹھے۔ حسینی خان نے بادل ناخواستہ سارنگی کو غلاف چڑھایا اور گھر کی راہ لی۔

گوندنی کے پیڑوں کی شاخوں سے تیتروں کے جو رنگ برنگے منکوں والے پنجرے لٹک رہے تھے انہیں وہیں ٹنگا رہنے دیا گیا۔ باہر سے جو شاعر مشاعرے کے سلسلے میں آئے تھے، نگینہ سائیں نے انہیں بھی پنچایت میں بٹھا لیا۔

جب قصبے کے سب چھوٹے بڑے اکٹھے ہو گئے تو سائیں اپنی کملی سنبھالتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑے نرم لہجہ میں مجمع سے یوں خطاب کرنے لگا:

''بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ لوگوں کے آپس کے معاملوں میں کبھی دخل نہیں دیا، اور نہ آج تک کسی پنچایت ہی میں حصہ لیا ہے۔ مگر اب کے ایسا نازک معاملہ آ پڑا ہے جس سے میرا ذاتی تعلق ہے۔ اسی لئے میں نے آپ صاحبان کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے قصبے کے مشہور شاعر استاد فلک کی ایک بیٹی ہے جس کی ماں مر چکی ہے۔ اس کی پرورش ہمارے قصبے کے پٹواری شمس الدین صاحب نے اپنی اولاد کی طرح کی ہے۔ اس پنچایت میں لڑکی کا باپ اور پٹواری صاحب

دونوں موجود ہیں۔ اگر میں کوئی غلط بات کہوں تو یہ صاحبان مجھے فوراً ٹوک دیں۔ یہ لڑکی اب جوان ہو چکی ہے۔ اور ہم سب کی دلی خواہش ہے کہ اس کا رشتہ کسی اچھی جگہ ہو۔ اور اسی گاؤں کے اندر ہو۔''

اس پر ہر طرف سے ''بے شک۔ بے شک!'' کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ پٹواری نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب خاموشی ہوئی تو نگینہ سائیں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''شاید آپ میں سے کچھ صاحبان کو معلوم ہو کہ لڑکی کا باپ اس کے لئے شہر کا ایک رشتہ لایا ہے۔ یہ رشتہ اچھا ہے یا برا۔ اس بات کو تو جانے دیجیے۔ ہمیں تو پہلے یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی کے لئے اس قصبے ہی میں کوئی معقول رشتہ مل سکتا ہے یا نہیں۔ شہر میں بیاہنے کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔ کیوں بھائیو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''بے شک...... بے شک۔'' اب کے پھر بہت سی آوازیں سنائی دیں۔

اچانک پٹواری اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سائیں جی!'' اس نے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو اس معاملے میں مَیں بھی کچھ کہوں؟''

''شوق سے۔'' سائیں نے جواب دیا۔

''مجھے آپ کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لڑکی ابھی کم عمر ہے۔ اس لیے اس معاملے کو ابھی دو تین سال کے لیے ملتوی کیا جا سکتا ہے۔''

''ہاں ملتوی کیا جا سکتا ہے۔'' سائیں نے جواب دیا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ لڑکی کے باپ کا ارادہ دنیا سے کنارہ کش ہو کے مکے شریف چلے جانے کا ہے۔ خدا ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے اس فرض سے سبک دوش ہو جانا چاہتا ہے۔ کیوں استاد فلک جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں سائیں بادشاہو! یہی بات ہے۔''

سائیں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی اسی گھمبیر آواز میں کہنا شروع کیا:

''اب میں معاملے کے ایک اور پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جس وقت خدا بخش فلک نے اپنی بیٹی کو پٹواری صاحب کی سرپرستی میں دیا تھا تو کہا تھا کہ میں ہر مہینے لڑکی کا خرچ شہر سے بھیجتا رہوں گا۔ مگر تنگدستی یا کسی اور وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ لڑکی آٹھ دس برس تک پٹواری صاحب کے گھر ہی میں پلی بڑھی ہے۔ آخر اس عرصے میں اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے پر کچھ نہ کچھ خرچ آیا ہی ہوگا۔ اگر پٹواری صاحب پسند فرمائیں تو اس امر کا فیصلہ بھی ہو جانا چاہیے کہ استاد فلک پر ان کی کس قدر رقم نکلتی ہے۔''

''اس وقت نہیں۔ میں پھر کبھی اس معاملے پر گفتگو کروں گا۔''

مگر نگینہ سائیں اپنی بات پر مُصر رہا:

''پھر کبھی کی بات نہیں پٹواری صاحب! ان جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ہی تو ہم آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ پھر نہ جانے استاد کہاں ہو اور آپ کہاں۔''

اس پر چودھری رحمت علی، چودھری خیر دین اور کئی دوسرے لوگوں نے بھی زور دیا۔
"ہاں ہاں پٹواری صاحب! اچھا ہے کہ اس امر کا بھی فیصلہ ہو جائے۔"
اس پر پٹواری دوبارہ بادل ناخواستہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ یہ بات قصبے میں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ پٹوارن مہتاب بی بی سے نوکرانیوں سے بھی بڑھ کر کام لیا کرتی تھی۔ دونوں وقت کھانا پکانا، کنویں سے پانی بھر کے لانا، گائے بھینسوں کی سانی دینا، پٹوارن کے ہاتھ پاؤں دابنا۔ یہ سارے کام اس اکیلی جان کے ذمے تھے۔ اس لئے اس کی پرورش کے خرچ کا مطالبہ کرنا ایک نہایت ہی گھٹیا حرکت ہوتی۔
دوسری طرف پٹواری اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ استاد پر اس کا سب سے بڑا دباؤ یہی تھا۔ بالآخر اس نے کہا:
"سائیں جی نے خواہ مخواہ یہ ذکر چھیڑ دیا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے اس کی پرورش کسی لالچ سے نہیں کی بلکہ میں نے اور میری گھر والی نے اس کو اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہے اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ وہ ایسی جگہ بیاہی جائے جہاں وہ آرام سے اور خوش خوش رہے۔ خدا بخش کو ناحق اس کی فکر ہو گئی ہے۔ بھلا جہاں ہم نے اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے وہاں اس کی شادی کی فکر نہ کریں گے۔"
یہ کہہ کے وہ بیٹھ گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی تقریر سے سخت بے لطف ہوا ہے۔ اب استاد فلک کی تقریر کرنے کی باری تھی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ مشاعرے والی تقریر کی طرح وہ اب کے پھر صوفیانہ استعارات و تمثیلات سے کام لے گا۔ اور جذب و کشف کے کرشمے دکھائے گا۔ مگر اس نے ان سب باتوں سے گریز کیا اور سیدھے سادے انداز سے کہا:
"بھائیو! پٹواری صاحب کا میں احسان مند ہوں۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ مجھے افسوس ہے کہ ان کو میری طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل ان کی طرف سے صاف ہے۔"
"بھائیو! شاید وطن میں میرا یہ آخری پھیرا ہو۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹی کی طرف سے سبک دوش ہو جاؤں۔ صاحبو! مجھے کسی امیر گھر کی بھی تمنا نہیں۔ میرا داماد چاہے غریب ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ اس کے گھر میں بس جائے۔ اور خوش رہے۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں اور اپنے مولا سے بخشش کا امیدوار ہوں۔"
یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ بیٹھ گیا۔
اب سب کی نظریں سلطان کے چچا چودھری رحمت علی کی طرف اٹھیں جو قصبے کے معزز زمینداروں میں سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کو اپنا منتظر پا کر چودھری اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا:
"مجھے خوشی ہے کہ ہمارے قصبے میں چند روز سے جو کشاکش پیدا ہو گئی تھی وہ بغیر کسی بدمزگی کے ختم ہو گئی۔ سوال اب لڑکا تلاش کرنے کا رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کے لئے دو چار دن کی مہلت درکار ہو گی۔ کیوں پٹواری صاحب!"

''جی ہاں! دو چار دن کیا مہینہ دو مہینے بلکہ سال چھ مہینے میں بھی یہ کام نمٹ جائے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔''

لوگ سمجھ رہے تھے کہ پنچایت جس مقصد کے لئے کی گئی تھی وہ پورا ہو گیا۔ اور وہ اپنے گھروں کو جانے ہی والے تھے کہ نگینہ سائیں پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا:

''بھائیو! تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ ابھی مجھے اپنا وہ خاص مقصد بیان کرنا ہے جس کے لئے میں نے آپ صاحبان کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ چونکہ لڑکی کے باپ نے امیر غریب کی تفریق مٹا دی ہے۔ اس لئے اجازت ہو تو لڑکی کے لیے ایک رشتہ یہ فقیر پیش کرے۔''

استاد فلک، پٹواری اور دوسرے لوگ سائیں نگینہ کی یہ بات سن کر چونک سے اٹھے۔ بعض نے سمجھا کہ اس فرزانگی کے بعد اب سائیں پر دیوانگی کا دور آیا چاہتا ہے۔ استاد فلک نے جن کی طبیعت اب خوش طبعی کی طرف مائل تھی، مسکرا کر پوچھا:

''وہ کون لڑکا ہے سائیں بادشاہو؟''

''چراغ کا بیٹا مولو!'' نگینہ سائیں نے اپنی گھمبیر آواز میں ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

چراغ اس پنچایت میں ایک طرف کونے میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بیٹے کا نام سن کر بھونچکا رہ گیا۔ سب لوگ اس کی طرف تعجب کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جن کی وہ تاب نہ لا سکا اور اس نے سر جھکا لیا۔

''صاحبو!'' نگینہ سائیں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ چراغ ہمارا ایک غریب کسان بھائی ہے۔ آپ شاید یہ پوچھیں کہ وہ اس شادی کا بوجھ کیسے اٹھا سکے گا؟ میں اس سوال کا جواب عرض کئے دیتا ہوں۔ میں نے اس قصبے میں زمین کا ایک ٹکڑا خریدا ہے جسے میں لڑکی کے جہیز میں دینا چاہتا ہوں۔ یہ زمین زیادہ بڑی تو نہیں مگر اتنی ضرور ہے کہ اس سے ایک چھوٹا سا کنبہ بخوشی گزر کر سکے۔''

یہ کہہ کر سائیں خاموش ہو گیا۔ لوگ اور بھی حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگے۔ اس پر وہ یکبارگی ہنس پڑا۔

''آپ لوگ حیران نہ ہوں۔'' وہ بولا۔ ''فقیر کے پاس بھلا مال و زر کہاں سے آیا۔ وہ بات یہ ہے کہ خدا بخشے چودھری رحمت علی نے مرنے سے بہت دن پہلے ایک معقول رقم اس مطلب کے لیے وقف کر دی تھی کہ اسے کسی نیک کام میں خرچ کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر نیکی کا کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے چودھری صاحب مرحوم کی روح یقیناً بہت خوش ہو گی۔''

یہ سن کر پٹواری پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ دل میں سمجھ رہا تھا کہ اتنی جلدی لڑکی کے لئے رشتہ کہاں سے مل سکے گا۔ دو چار دن میں بات آئی گئی ہو جائے گی اور لڑکی اسی کے قبضے میں رہے گی۔ اور پھر وہ رفتہ رفتہ لوگوں کو اپنے موافق بنا کے اپنے لنگڑے بھتیجے سے اس کی شادی کر دے گا۔ مگر نگینہ سائیں نے اچانک ایسی صورت حال پیدا کر دی جس کا کوئی توڑ ہی نہ تھا۔

چراغ ایک نہایت مسکین اور غریب کسان تھا جس سے سب قصبے والے ہمدردی رکھتے تھے۔ نگینہ سائیں کی اس تجویز پر ان سب کو دلی مسرت ہوئی۔ یہاں تک کہ استاد فلک نے سر ہلا کے اپنی خوشنودی

ظاہر کردی۔ اس پر ہر طرف سے چراغ کو مبارک باد دی جانے لگی اور عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ مہتاب بی بی اور مولو کی سگائی ہو گئی۔

اچانک استاد فلک اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرف گیا جہاں مولو اپنے باپ کے پاس، دل پر قابو رکھے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ استاد نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

مولو کو سلطان کا جواب مل گیا تھا۔ شام کے جھٹ پٹے میں گوندنی والا تکیہ اپنی پوری بہار پر تھا۔ نگینہ سائیں کے چیلے چرس کے دم لگا رہے تھے اور گھڑے کی سنگت میں بہادر شاہ ظفر کے ضبط شدہ دیوان کی غزل گا رہے تھے۔

دمدمے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی
اے ظفر بس ہو چکی تلوار ہندوستان کی

نگینہ سائیں ان سے ذرا ہٹ کے اپنی جھلنگی چارپائی پر آنکھیں بند کیے اکڑوں بیٹھا تھا۔ سلطان ایک پیڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر کچھ دیر تک تکیے کا یہ منظر دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ رات کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا تکیے سے نکل آیا۔ اور وہاں سے سیدھا قصبے کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور پھر سب سے پہلے آنے والی ٹرین میں سوار ہو کر ایک ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گیا جس کی خود اس کو بھی خبر نہ تھی۔

میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں نہ جانے کب تک یونہی نیم تاریکی میں بیٹھا بیس برس پہلے کی ان بھولی بسری باتوں کو یاد کرتا اور ماضی سے اپنا رشتہ جوڑتا رہا۔ قصبے سے بھاگ نکلنے کے بعد ایک مدت تک میں نے اپنے جنم بھوم سے بالکل بیگانگی اختیار کیے رکھی تھی لیکن آخر جب میں ملک ملک کی سیاحت سے تھک گیا اور سر میں آزادی کی جو ہوا سمائی تھی وہ بھی بڑی حد تک نکل گئی اور میں اجنبی دیس میں بس گیا تو میں نے اپنے بعض عزیزوں کو اس امر کی اطلاع دے دی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی کبھی ان کے مرنے جینے کی خبریں مجھ تک پہنچنے لگیں۔ لیکن قصبے کے حالات سے میں بے خبر ہی رہا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ میرے اقرباء نے بھی رفتہ رفتہ گاؤں کی رہائش ترک کر کے شہروں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان بیس برس کے عرصے میں جو میں نے وطن سے باہر گزارا تھا، مجھے وطن کی یاد رہ رہ کر ستاتی رہی تھی۔ بسا اوقات گوندنی والے تکیے کا نقشہ اور قصبے کے بعض لوگوں خصوصاً مہتاب بی بی اور مولو کی صورتیں آنکھوں تلے پھرنے لگتیں اور میرا دل یہ جاننے کے لئے بے قرار ہو جاتا کہ میرے بعد اُن پر کیا گزری!

کبھی کبھی تصور ایک چھوٹے سے زمیندار کے گھر کا نقشہ میری نظروں کے سامنے پیش کر دیتا۔ میاں ایمان دار اور بخشی۔ بیوی قبول صورت اور سلیقہ مند۔ ایک دوسرے پر فدا۔ غریب مگر اپنی حالت پر قانع، دو تین خوب صورت اور تندرست بچے آنگن میں کھیلتے ہوئے۔ ان کے قہقہوں سے گھر بھر میں شادمانی۔ پھر یہ خیال کر کے ان کی پر مسرت زندگی کا موجب کسی حد تک میں بھی ہوں، میرا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا۔

میں ہوٹل کے کمرے میں کمبل اوڑھے، کرسی پر بیٹھا ماضی کے ان ہی تصورات سے لطف اندوز ہو رہا

تھا کہ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے شانوں سے کمبل کو ہٹایا۔ کمرے کی بجلی روشن کی اور دروازے کی چٹخنی کھولی۔

یہ ہوٹل کا منیجر تھا۔ اس نے گرم جوشی سے میری مزاج پرسی کی اور پوچھا۔ جناب کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ پھر کہا کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے انہیں دفتر میں بٹھایا ہے۔

میرا خیال فوراً اپنے وکیل کی طرف گیا۔ جس کی ہدایت کے موجب میں اس ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میں نے کہا۔

''مہربانی کر کے وکیل صاحب کو میرے کمرے میں بھیج دیجیے۔''

''مگر یہ وکیل صاحب تو نہیں ہیں۔''

''پھر کون ہیں؟''

''میں نے نام تو پوچھا نہیں۔ لیکن کوئی زمیندار معلوم ہوتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے بھیج دیجیے۔''

اور میں بڑے اشتیاق کے ساتھ اس ملاقاتی کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک لمبا تڑنگا شخص جھکتا جھجکتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ گاڑھے کا کرتہ اور تہمد۔ سفید صاف، ہلکے گلابی رنگ کی دھاریوں والی چادر کی بکل مارے، داڑھی منڈھی ہوئی، چھوٹی چھوٹی بھورے رنگ کی مونچھیں۔ ہم دونوں کچھ دیر بڑی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر یکبارگی میں اس کی طرف لپکا اور وہ میری طرف۔

''مولو!'' بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

''سلطان بابو!'' اس نے بھی بڑے جوش و خروش سے کہا۔

اور ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہر چند صافے نے اس کے سر کے بھورے بالوں کو چھپا رکھا تھا۔ مگر مونچھوں نے غمازی کر دی تھی۔ اس بیس برس کی مدت میں اس کے خدوخال میں تو کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ البتہ اس کے چہرے کی شادابی جو کبھی دائمی معلوم ہوا کرتی تھی، اب مفقود ہو چکی تھی۔

''تمہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے بھائی صاحب یعنی چودھری رحمت علی کے بڑے بیٹے پچھلے جمعہ کو یہیں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ بھی آج کل میں آنے والے ہیں۔''

اس کے بعد ہم پھر کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے رہے۔

''سناؤ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا باپ کبھی کا مر چکا ہے اور میں اب دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔''

''اور بال بچے؟''

''کیسے بال بچے؟''

''تو کوئی اولاد نہیں ہوئی تمہارے؟''

"جب شادی ہی نہیں کی تو اولاد کیسے ہو جاتی؟"

"کیا کہہ رہے ہو تم مولو؟ اور وہ جو مہتاب بی بی سے تمہاری سگائی ہوئی تھی؟ یہ اسی روز کی ہی تو بات ہے جس روز میں یہاں سے بھاگا تھا۔

مولو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔

"پٹواری نے بعد میں کوئی گڑبڑ پیدا کر دی تھی کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں پٹواری نے کوئی گڑبڑ پیدا نہیں کی۔"

"تو پھر استاد فلک نے کوئی رکاوٹ ڈال دی ہو گی؟"

"نہیں ایسا بھی نہیں ہوا۔"

"تو پھر کیا بات ہوئی!" میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

اس پر مولو نے ایک گہرا اور لمبا سانس لیا۔

"لمبا قصہ ہے سلطان بابو!" اس نے کہا۔ "ذرا دم تو لینے دو! ابھی سناتا ہوں۔"

میری بے تابی لحہ لحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اصرار کے ساتھ کہا۔

"مولو! مولو! خدا کے لیے جلد بتاؤ۔ میں اب زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔"

یہ سن کر مولو کچھ دیر خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا اسے میری اس بے تابی پر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔

"بات یہ ہے سلطان بابو!" آخر اس نے زبان کھولی۔

"مہتاب بی بی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھ سے کیا قصبے کے کسی شخص سے بھی نہیں۔ اس نے زبان سے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ اور نہ اپنا بھید ہی کسی کو بتایا مگر میں جانتا تھا کہ اس کو کیا غم ہے۔ جس رات تم چپ چپاتے کسی کو بتائے بغیر یہاں سے بھاگے تھے اس کے دوسرے ہی روز سارے قصبے میں یہ خبر مشہور ہو گئی تھی۔ تمہارے چچا چودھری رحمت علی مرحوم نے تمہاری تلاش میں بہت دوڑ دھوپ کی۔ انہوں نے لاہور، امرتسر اور دوسرے شہروں کے خود چکر لگائے اور اخباروں میں اشتہار بھی چھپوائے کہ جو کوئی تمہارا پتہ بتائے گا اسے بھاری انعام دیا جائے گا مگر تمہارا کچھ کھوج ہی نہ ملا۔ آخر ہم سب تمہاری طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔

اسی زمانے کی بات ہے۔ ایک دن پٹواری نگینہ سائیں کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ مہتاب بی بی کو ہر وقت بخار رہتا ہے۔ وہ کئی دن سے سخت بیمار ہے اور پچھلے چار پانچ روز سے تو اناج کا ایک دانہ بھی اس کے حلق سے نہیں اترا۔ یہ سن کر نگینہ سائیں کو سخت پریشانی ہوئی۔ اس نے چچا فلک کو جو شہر چلا گیا تھا خط لکھ کر بلوایا۔ وہ اپنے ساتھ ایک حکیم کو بھی لیتا آیا۔ اس کے علاوہ آس پاس کے دیہات سے بھی کئی حکیم آ کے مہتاب کو دیکھ گئے۔ مگر اسے کسی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ روز بروز گھلتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی

روگ اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔
ایک دن اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں اسے تمہارے جانے کا غم تو نہیں کیونکہ جس روز تمہارے غائب ہونے کی خبر پھیلی تھی اسی روز سے اس کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے ایک لڑکی کو اپنا راز دار بنایا۔ تمہیں یاد ہوگا زینب نام کی ایک لڑکی ہوتی تھی مہتاب کی سہیلی، ٹھگنا قد، موٹی پھپس۔ مہتاب کے گھڑے کے ساتھ میں کبھی کبھی اس کا گھڑا بھی بھر دیا کرتا تھا۔ میں نے اسے یہ بات سمجھائی کہ تم مہتاب کی خبر لینے جاؤ اور جب وہ اکیلی ہو تو اس کے کان میں کہو۔ مولو نے کہلا بھیجا ہے مہتاب غم نہ کر۔ سلطان بابو کہہ گیا ہے کہ میں شہر کی سیر کر کے دو مہینے میں آ جاؤں گا۔''
تمہارا نام سننا تھا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ اس نے بہتیرا روکا مگر آنسو نہ رکے اور اس نے چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔ وہ چند ہی روز میں سوکھ کے کانٹا ہوگئی تھی۔ جو کوئی دیکھتا کہتا بس دو تین روز کی مہمان ہے۔ مگر اس نے کسی نہ کسی طرح دو مہینے تک اپنے کو زندہ رکھا۔ آخر میں اس کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ ہر وقت آہٹ پر کان لگائے رکھتی تھی۔ اور ہر آنے والے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ الفاظ اس کے ہونٹوں تک آتے تھے مگر وہیں رک جاتے تھے۔ آخر پورے دو مہینے اور دس روز بستر پر پڑے رہنے کے بعد وہ جمعہ کے روز چل بسی۔ تمہیں یاد ہوگا جس دن تم بھاگے تھے وہ بھی جمعہ ہی کا دن تھا۔''
چند لمحے توقف کر کے اس نے پھر کہا۔
''سلطان بابو! میں جانتا ہوں کہ تمہیں اس سے اتنی محبت نہ تھی جتنی کہ مجھ کو اس سے تھی اور تم نے میرے ہی لئے یہ قربانی دی تھی۔ مگر تمہاری یہ قربانی میرے کام نہ آئی۔ کیونکہ میری قسمت میں محرومی لکھی تھی۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ تم میرا کہنا مان لیتے اور خود اس سے شادی کر لیتے۔''
مولو یہ کہہ کے خاموش ہوگیا۔ میں ایک سکتے کے عالم میں یہ قصہ سن رہا تھا۔ میں نے اس سے کوئی اور بات نہ پوچھی۔ کیونکہ میرا سارا اضطراب اور جوش ایک دم سرد پڑ چکا تھا۔ میں اپنے میں ایک نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے کسی کو چکر آ رہے ہوں۔ نہ کچھ کہنے کی سکت تھی نہ کچھ سننے کی۔
مولو کو میری اس حالت پر شاید رحم آ گیا۔ اس نے کہا:
''یہ واقعہ اب اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ اس پر غم کرنا بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ سلطان بابو! کاش تم جانے سے پہلے کم از کم مجھ ہی کو اپنا پتہ بتا گئے ہوتے۔ اس طرح شاید اسے مرنے سے بچایا جا سکتا!!''
میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہم دونوں دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر مولو نے خود ہی قصبے کے اور لوگوں کا ذکر چھیڑ دیا!

''تمہارے جانے کے بعد پانچ چھ برس ہی میں تمہاری جان پہچان کے کئی لوگ اٹھ گئے۔ سب سے پہلے بابا علیا مرا۔ اس کے بعد پٹواری۔ اس کا لنگڑا بھتیجا ابھی تک زندہ ہے۔ اور الٹا چچا کی جائیداد پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ پٹواری کے بعد حسینی خاں مرا جو تکیے میں گوندنی کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سارنگی بجایا کرتا تھا۔ پھر تمہارے چچا خدا بخش چل بسے۔ ان کے فوت ہونے کی اطلاع تو تمہیں مل ہی گئی ہوگی۔''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔

''ان کے بعد نگینہ سائیں چل بسا۔ اس کے مرنے کے بعد تکیہ اُجڑ گیا۔ اور وہ بات نہ رہی جو نگینہ سائیں کے دم سے تھی۔ رفتہ رفتہ تکیے میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ اور آخر قصبے والوں نے پنچایت کر کے تکیے کا نام ونشان ہی مٹا دیا۔

اور..........

''مولو میں یہ قصہ سن چکا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

دراصل میں اب تنہائی چاہتا تھا۔ تاکہ کم از کم ایک رات تو اپنی اس بھولی بسری محبت کا سوگ منا سکوں۔

مولو جلد ہی میرا مدعا سمجھ گیا اور اگلے روز مجھے قبرستان لے چلنے کا وعدہ کر کے جہاں مہتاب بی بی، میرے والدین اور دیگر عزیز و اقارب کی قبریں تھیں، رخصت ہو گیا۔

مولو کے چلے جانے کے بعد مجھ پر نیم مدہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ بار بار دل میں کہتا تھا۔ کاش! میں نے وطن کا یہ چکر لگایا ہی نہ ہوتا اور اس طرح میرے لیے یہ المناک واقعہ ہمیشہ کے لیے ایک سربستہ راز ہی بنا رہتا۔ اور میں اپنے ذہن میں ایک مسرور اور شادمان جوڑے کا تصور جما کے خوش ہو لیا کرتا، لیکن اب حقیقت حال کھلنے پر مجھے خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگی تھی۔ کیونکہ مہتاب بی بی کی موت کا باعث میں اور صرف میں تھا۔

میں نے مہتاب کے عشق کا کبھی دم نہیں بھرا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کی نظریں خواہ میں مجمع میں کہیں بھی کھڑا ہوتا، اور خواہ وہ مجمع کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہوتا، میرا کھوج لگا ہی لیتیں۔ اور پھر جلد ہی جھک جاتیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پھول جیسے شاداب رخسار تمتما اٹھتے۔ یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل میں بھی، خواہ وقتی طور پر ہی سہی، ہلچل سی پیدا ہو جاتی۔ اور مجھے خود پر فخر سا محسوس ہونے لگتا۔

مجھے ان نگاہ بازیوں سے احتراز واجب تھا، مجھے اپنی توجہ اس کی طرف سے فوراً ہٹا لینی چاہیے تھی۔ اور اس سے پہلے کہ مہتاب کے دل میں کوئی مسموم نخل نمو پائے اس کی بیخ کنی کر دینی چاہیے تھی۔ لیکن میں نظر بازی کی اس لذت کو محض ایک بے ضرر سا دل بہلاوہ تصور کرتا تھا۔ جیسے کوئی چھپ کے شراب پی لے اور پھر نشہ اترنے پر اس کے سرور کو بھول جائے۔

میری طرح بہت سے مردوں اور عورتوں نے اپنی جوانی میں یہ کھیل کھیلے ہوں گے۔ مگر مہتاب ایک بالکل مختلف قسم کی لڑکی تھی۔ پُرخلوص، وفا شعار اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی۔ اس نے چپکے چپکے اپنے

دل کی گہرائیوں میں محبت کے اس مسموم نخل کو پھلنے پھولنے دیا۔ یہاں تک کہ اس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ انہیں اکھاڑ پھینکنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔

مجھے اپنی زندگی میں متعدد عورتوں سے واسطہ پڑا۔ اور کئی دفعہ حرماں نصیبی کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ مگر میں نے محبت کا سوگ ہفتے دو ہفتے سے زیادہ نہیں منایا۔ ہاں مہتاب بی بی کی بات دوسری ہے۔ اس کا غم میرے دل کے لیے ایک ایسا زخم ثابت ہوا، جو آج تک نہ بھر سکا۔

☆☆☆

(مشمولہ ''ماہِ نو'' لاہور، اپریل، مئی، جون ۲۰۰۶ء)

غلام عبّاس: فکروفن